

فقہ قرآن

فقہ قرآن سے متعلق تمام قدیم و جدید نظریوں پر مبسوط اور مفصلاً بحث کی گئی ہے اور قرآن مجید کے ہونے کی حقیقت کو دل نشین پیرایہ میں واضح کیا گیا ہے، نیز بتایا گیا ہے کہ وہی الہی اور کلام ربانی اور قطعی منشا معلوم کرنے کے لئے شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشادات اور اقوال و اعمال کا لڑنا کیوں ضروری ہے، اس سلسلہ میں تدوین حدیث اور اس سے متعلق مباحث فتنہ وضع حدیث کے ان سداذ احادیث کے ذریعہ اعتبار صحابہ کی عدالت کثرت سے روایت کرنے والے بعض صحابہؓ کی حیات دور البعین کی خصوصیات اور دیگر اہم عنوانات پر ایک خاص اسلوب سے تفصیلی کلام کیا گیا ہے

تالیف

مولانا سعید احمد ایم اے، فاضل دارالعلوم

مدیر اعلیٰ بہان

باہتمام نیشنل پبلسر ندوۃ المصنفین قمرول باغ دہلی

مطبوعہ جمال پرنٹنگ پریس دہلی

قیمت غیر مجلد
دو روپے چار آنے

طبع ثانی
۲۰۲۲
۲۱۹۳۵۱

مجلد
دو روپے چار آنے

135440





فہم قرآن

فہرست مضامین

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۷	عربیت (شرط اول)	۹	مسلمانوں میں مرکزیت کا فقدان
=	ذوق لسانی	۱۰	مرکز کی اہمیت
۳۰	ہر کلام کا صحیح مفہوم ایک ہی ہوتا ہے	=	مسلمانوں کا مرکز
۳۱	بلاغت کے مختلف مدارج و مراتب	۱۱	کلمۃ حق اُرید بما لباطل
	ذمیوی امور میں ماہرین کی طرف رجحان	۱۲	ادعا رباطل کا اصل سبب
۳۲	کی جاتی ہے۔	۱۵	قرآن کے آسان ہونے کا مطلب
۳۳	تفسیر کی تعریف	۱۶	قرآن ہدایت و نصیحت کی کتاب ہے
۳۴	دو اماموں کی رائے	۱۷	فہم قرآن سے مراد۔
۳۷	اصوات و لہجات عرب کا علم	۱۹	قرآن احکام و مسائل کی کتاب ہے۔
۳۸	دوسری شرط ذوق قرآنی	۲۰	صحابہ فہم قرآن میں برابر نہیں تھے۔
۴۰	تیسری شرط اتقار	=	بعض خاص خاص صحابہ کا ذوق قرآن فہمی
۴۲	اتقائی ایک عقلی توجیہ	۲۱	حضرت ابن عباسؓ کی رمز شناسی
۴۶	چوتھی شرط	۲۳	تفسیر قرآن میں اسلاف کی احتیاط
۴۸	ایک شبہ اور اس کا جواب	۲۴	اس درجہ احتیاط کا سبب
۴۹	ذکر کی بحث	=	تفسیر بالرائے پر وعید اور اس کا مطلب
۵۲	احکام قرآن میں بصیرت	۲۶	فہم قرآن کے شرائط

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۹۳	دین کا مدار قرآن و سنت دونوں پر ہے	۵۴	نکتہ
۹۵	حدیث کی تشریحی حیثیت اور اس سے غرض	=	ناسخ و منسوخ
		=	نسخ سے مفسرین کی مراد
	تدوین حدیث	۵۹	قرآن میں نسخ کی حقیقت
۹۹	عہد نبوت اور تدوین حدیث	۶۳	ایک شبہ اور اس کا ازالہ
۱۰۱	بعض خاص صحیفے	۶۶	تفسیر و تاویل کا فرق
۱۰۲	تحریر تدوین حدیث		کیا قرآن مجید بغیر سنت کے صحیح معنی میں
۱۰۳	درس حدیث		سمجھ میں آسکتا ہے؟
"	عہد نبی عباس میں تدوین حدیث کا آغاز	۷۰	
۱۰۴	کتب حدیث کی ترتیب میں اختلاف	۷۲	قرآن میں اتباع رسول کا حکم
"	کتب حدیث میں فرق مراتب	۷۷	حدیث کی تشریحی حیثیت
۱۰۵	تنقید احادیث	۸۰	ایتار اور نہی کی اسناد مجازی ہے یا حقیقی
	وضع احادیث کا فتنہ اور اس کا اسناد	۸۲	آیات قرآنی کا صحیح مفہوم سنت کے بغیر متعین نہیں ہو سکتا
۱۰۶	وضع احادیث کا چرچا	۸۳	حضرت عمران بن حصین کا استدلال
"	وضا عین حدیث کے مختلف طبقے	۸۴	سنت اور لغت
۱۰۷	اسباب وضع حدیث		بعض دفعہ کلام کی مراد بجز مخاطب کے
۱۰۹	عہد صحابہ میں عدم کتابت حدیث کے وجوہ	۸۵	کوئی دوسرا متعین نہیں کر سکتا۔
۱۱۱	قبول حدیث میں صحابہ کی احتیاط	۸۶	ایک غلط فہمی کا ازالہ
۱۱۲	بے تحقیق روایت پر وعید	۸۸	صحابہ کرام اور سنت کا احترام

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۳۰	نام و نسب	۱۱۳	کثرتِ روایت سے اجتناب
۷	مستشرقین کا اعتراض اور اس کا جواب	۱۱۲	حدیث پر شہادت
	حضرت ابن عباسؓ پر آنحضرت صلی اللہ	۱۱۷	طلبِ حدیث کے لئے سفر
۱۳۱	علیہ وسلم کی نظرِ شفقت و تربیت	۱۱۸	حدیث بیان کرتے وقت دہشت اور خوف
	وفاتِ نبوی کے وقت حضرت ابن عباسؓ	۱۱۹	کثرت سے روایت کرنے والے صحابہ
۱۳۲	کی عمر		حضرت ابو ہریرہؓ
۷	علمی کمال		
۱۳۳	علمی شوق	۱۲۰	اسلام اور جستجوئے علم
۱۳۴	صحابہ میں آپ کی قدر و منزلت	۱۲۱	حضرت ابو ہریرہؓ کے لئے دعا نبوی
۱۳۶	روایت میں احتیاط	۱۲۲	جلالتِ علم
۷	مرویات کی تعداد	۷	روایات
۱۳۷	صحابہ سب عادل ہیں	۱۲۳	کثرتِ روایت کے اسباب
۱۳۸	عدالت سے مراد	۱۲۴	اجلہ صحابہ ان پر اعتماد کرتے تھے
۷	شاہ عبدالعزیزؒ کا ارشاد	۱۲۶	قوتِ حافظہ
		۱۲۷	حدیث کی کتابت
	تالبعین کا دور	۷	احتیاط
۱۳۹	درسِ قرآن و حدیث کے مرکز	۱۲۸	حق گوئی
۱۴۰	امام زہریؒ	۷	عام تبصرہ
۱۴۱	کتابتِ حدیث		
۷	حفظِ حدیث		حضرت عبداللہ بن عباسؓ

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۹۳	دین کا مدار قرآن و سنت دونوں پر ہے	۵۲	نکتہ
۹۵	حدیث کی تشریحی حیثیت اور اس سے غرض	=	ناسخ و منسوخ
		=	نسخ سے مفسرین کی مراد
	تدوین حدیث	۵۹	قرآن میں نسخ کی حقیقت
۹۹	عہد نبوت اور تدوین حدیث	۶۳	ایک شبہ اور اس کا ازالہ
۱۰۱	بعض خاص صحیفے	۶۶	تفسیر و تاویل کا فرق
۱۰۲	تخریک تدوین حدیث		کیا قرآن مجید بغیر سنت کے صحیح معنی میں
۱۰۳	درس حدیث		سمجھ میں آسکتا ہے؟
"	عہد نبی عباس میں تدوین حدیث کا آغاز	۷۰	
۱۰۴	کتب حدیث کی ترتیب میں اختلاف	۷۲	قرآن میں اتباع رسول کا حکم
"	کتب حدیث میں فرق مراتب	۷۷	حدیث کی تشریحی حیثیت
۱۰۵	تنقید احادیث	۸۰	ایتار اور نہی کی اسناد مجازی ہے یا حقیقی
	وضع احادیث کا فتنہ اور اس کا انسداد	۸۲	آیات قرآنی کا صحیح مفہوم سنت کے بغیر متعین نہیں ہو سکتا
۱۰۶	وضع احادیث کا چرچا	۸۳	حضرت عمران بن حصین کا استدلال
"	وضا عین حدیث کے مختلف طبقے	۸۴	سنت اور لغت
۱۰۷	اسباب وضع حدیث		بعض دفعہ کلام کی مراد بجز مخاطب کے
۱۰۹	عہد صحابہ میں عدم کتابت حدیث کے وجوہ	۸۵	کوئی دوسرا متعین نہیں کر سکتا۔
۱۱۱	قبول حدیث میں صحابہ کی احتیاط	۸۶	ایک غلط فہمی کا ازالہ
۱۱۲	بے تحقیق روایت پر وعید	۸۸	صحابہ کرام اور سنت کا احترام

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۳۰	ایم و نسب	۱۱۳	کثرتِ روایت سے اجتناب
۴	مستشرقین کا اعتراض اور اس کا جواب	۱۱۲	حدیث پر شہادت
	حضرت ابن عباسؓ پر آنحضرت صلی اللہ	۱۱۷	طلبِ حدیث کے لئے سفر
۱۳۱	علیہ وسلم کی نظرِ شفقت و تربیت	۱۱۸	حدیث بیان کرتے وقت دہشت اور خوف
	وفاتِ نبوی کے وقت حضرت ابن عباسؓ	۱۱۹	کثرت سے روایت کرنے والے صحابہ
۱۳۲	کی عمر		حضرت ابوہریرہؓ
۴	علمی کمال		اسلام اور جستجوئے علم
۱۳۳	علمی شوق	۱۲۰	حضرت ابوہریرہؓ کے لئے دعا ربی نبوی
۱۳۴	صحابہ میں آپ کی قدر و منزلت	۱۲۱	جلالتِ علم
۱۳۶	روایت میں احتیاط	۱۲۲	روایات
۴	مرویات کی تعداد		کثرتِ روایت کے اسباب
۱۳۷	صحابہ سب عادل ہیں	۱۲۳	اجلہ صحابہ ان پر اعتماد کرتے تھے
۱۳۸	عدالت سے مراد	۱۲۴	قوتِ حافظہ
۴	شاہ عبدالعزیزؒ کا ارشاد	۱۲۶	حدیث کی کتابت
	تا بعین کا دور	۱۲۷	احتیاط
۱۳۹	درسِ قرآن و حدیث کے مرکز	۱۲۸	حق گوئی
۱۴۰	امام زہریؒ	۴	عام تبصرہ
۱۴۱	کتابتِ حدیث		حضرت عبداللہ بن عباسؓ
۴	حفظِ حدیث		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۶۱	حفظِ حدیث	۱۴۷	مرویات کی تعداد اور ان کا پایہ
"	طلبِ حدیث میں سفر	"	شیوخ
۱۶۲	تنقیدِ حدیث	۱۴۹	اسناد
۱۶۴	الجامع الصحیح	۱۵۱	اسناد کی اہمیت
۱۶۵	تعدادِ احادیث	۱۵۲	اسمار الرجال کی تدوین
"	شروطِ بخاری	۱۵۴	اسمار الرجال کی کتابیں
۱۶۷	صحیح بخاری اور صحیح مسلم کا موازنہ	۱۵۶	حدیث کی قسمیں
	اصولِ درایت	"	حدیث صحیح کی تعریف
		"	عدالت
۱۷۱	درایت کی ابتدا عہد صحابہ میں	۱۵۸	عدالت کے اعتبار سے طبقاتِ رواۃ
۱۷۳	درایت کے اصول	"	ضبط
	محدثین کی دلالتِ خدا علم و تہذیب	"	شذوذ
	از صفحہ ۱۸۷ تا صفحہ ۱۹۳	۱۵۹	علت
	ایک خط اور اس کا جواب	"	حدیثِ حسن کی تعریف
	از صفحہ ۱۹۴ تا صفحہ ۱۹۹	۱۶۱	امام بخاریؒ
			نام و نسب

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دیباچہ طبع ثانی

”فہم قرآن“ پہلی مرتبہ ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی تھی اور اس کو مطبوعات ”ندوۃ المصنفین“ کے دوسرے سیٹ میں شامل کر کے محسنین و معاونین ادارہ کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ اب تقریباً پانچ سال کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن زیادہ بہتر اور زیادہ مکمل صورت میں شائع ہو رہا ہے۔

مضامین کی ترتیب وغیرہ کے لحاظ سے طبع اول میں جو نقائص رہ گئے تھے اس قدر ان کو بڑی حد تک دور کر دیا گیا ہے اور بہت سے اہم اور مفید اضافے بھی کئے گئے ہیں، اسلوب بیان بھی کچھ سے کچھ ہو گیا ہے۔

وقت کے جدید مسائل پر ”ندوۃ المصنفین“ نے جو کتابیں شائع کی ہیں، ان میں ”فہم قرآن“ ایک خاص رنگ کی تبلیغی اور اصلاحی کتاب ہے۔ پھر اس کی اہمیت اس وجہ سے اور بھی بڑھ گئی ہے کہ موضوع کتاب کا تعلق ایک ایسے مسئلہ سے ہے جو آج کل خاص طور پر ہمارے بہت سے جدید تعلیم یافتہ اصحاب کی بحث و نظر اور غورو فکر کا مرکز بنا ہوا ہے۔

فہم قرآن اور تدوین احادیث کے متعلق جو مختلف نکتے یا مختلف قسم کی جو

انجمنیں ان حضرات کے دماغ میں ہیں وہ ان کا تشفی بخش اور دل پذیر حل دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ زیر نظر کتاب اسی ضرورت کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ اور اس مرحلے پر بے تکلف یہ عرض کیا جاسکتا ہے کہ "فہم قرآن" اس سلسلہ کی پہلی مستند اور متمم بالشان تالیف ہے جس میں اس مسئلہ کے تمام اہم اور ضروری گوشوں پر وقت کے جدید تقاضوں کی روشنی میں مفصل کلام کیا گیا ہے۔

دعا ہے حق تعالیٰ مصنف کی کاوش وسی مشکور فرمائے اور طالبان حق اس سے زیادہ سے زیادہ نفع اٹھائیں۔

عتیق الرحمن عثمانی

ناظم ندوۃ امہ مصنفین دہلی

۲۱ رمضان المبارک ۱۳۴۳ھ

مطابق ۳۰ اگست ۱۹۲۵ھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

جس طرح کسی شخص کے اعضاءِ ریشیہ میں فتور پیدا ہو جاتا ہے تو اس سے تمام جسم متاثر ہوتا ہے
معدہ و جگر بیمار ہوتے ہیں تو مریض کا مزاج، عادات و خصائل، چہرہ کا رنگ، جسم کی موزونیت یہ سب
چیزیں بدل جاتی ہیں، دماغ کا توازن خراب اور طبیعت میں ایک خاص قسم کا چڑچڑاپن پیدا ہو جاتا
ہے۔ ٹھیک یہی حال قوموں اور جماعتوں کا ہے۔ کسی قوم کے ارباب علم و فضل اس قوم کے لئے
قلب و جگر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پس ظاہر ہے اگر یہ تندرست اور قوی ہیں تو قوم کے افراد میں بھی
صحت و تندرستی کے آثار پائے جائیں گے، لیکن اگر برعکس سے ان لوگوں کا ہی حال سقیم ہے، خود
ان ہی کے دماغ کا توازن بگڑ گیا ہے اور ان میں آپس میں کجی و ہم خیالی، ہم مقصدی و ہم آہنگی
نہیں ہے تو پھر غریب افراد کا پوچھنا ہی کیا، وہ اگر ریگ کے ذروں کی طرح منتشر و پریشان ہوں تو
تعجب نہیں، اور اگر ان کا "خاکستر قومیت" دوش ہو اور جہالت و نادانی کے تیرہ و تاریکیوں میں آوارہ
بھریا ہے تو اس پر کوئی حیرت نہیں۔

آہ! کیونکر کہئے کہ آج مسلمانوں کی قوم کا حال بھی یہی ہے۔ جماعت جس چیز سے جماعت
بنتی ہے یعنی احساسِ مرکزیت، وہ سراسر ان میں مفقود ہے۔ ہر شخص ایک نئے خیال کا پابند اور ہر فرد
ایک نئے جذبہ و آہنگ سے ہم کنار ہے ایک مرض ہو تو اس کی شکایت کی جائے، زخم ایک ہو تو

اس کے لئے تدبیر چارہ گری کی جاسکتی ہے، جب جسم ہمہ تن داغ بن گیا ہو تو پنبہ و مرہم کہاں کہاں رکھا جائے۔ دامن و جبب اگر کہیں سے پھٹ گئے ہیں تو انہیں سیا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر دست و حشت نے ان کو تار تار کر دیا ہے تو پھر کیوں کسی کا احسان سوزن کاری و منت بخیزہ گری اٹھائیے کہ یہ سب تدبیریں اور چارہ سازیاں لاکھ کوششوں کے بعد بھی مفید ثابت نہیں ہو سکتیں۔

مرکز کی اہمیت | ہر جماعت کی روح رواں اس کا مرکز ہوتا ہے جب تک اس قوم کے

افراد میں مرکز سے وابستگی پائی جائے گی ان کی روح سرسبز و شاداب رہے گی اور جتنا جتنا اس وابستگی میں اضمحلال پیدا ہوتا جائے گا ان کی قومیت بھی مضحک، کمزور اور اراکے رفته ہوتی رہے گی یہاں تک کہ اگر یہ احساس مرکزیت بالکل ناپید ہو جائے تو پھر وہ جماعت جماعت نہیں رہتی اس کے افراد ٹوٹی ہوئی تسیح کے دانوں کی طرح منتشر اور گریبان عاشق کی مانند پراگندہ و متفرق ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی دنیا الگ ہر ایک کا مرکز خیال جدا، اور ہر ایک کا کعبہ مقصود دنیا ہوتا ہے، ان میں جماعتی وحدت مفقود ہو جاتی ہے اور انفرادی تشدد خیال، ان کے نظام جماعت کے شیرازہ کو پریشان کر کے رکھ دیتا ہے۔

مسلمانوں کا مرکز | مسلمانوں کا مرکز کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں

ایک اور صرف ایک ہے اور وہ قرآن ہے، ان کے تمام عبادات، معاملات، معاشرت، تمدن، تہذیب اور ان کے تمام اجتماعی اور اقتصادی نظام سب اسی ایک مرکز سے وابستہ اور اسی ایک رشتہ سے منسلک ہیں۔ ان کی تمام اخلاقی و روحانی برتریوں اور برتریوں کا دار و مدار صرف اسی ایک کتاب مبین کے تعالٰی پر ہے انھوں نے اس کی قیادت میں جب کبھی کسی جانب رخ کیا دشمنوں کی صفیں پہاڑ کی طرح مضبوط تھیں، دم کے دم میں الٹ گئیں اور کفر و شرک کے مضبوط قلعے مفتوح و سرنگوں ہو کر حق و صداقت کا پرچم اڑانے لگے۔ انھوں نے قرآن کی مشعل کو ہاتھ میں لئے ہوئے جس کسی وادی پر ظلمت کی جانب اپنے گھوڑوں کی باگیں موڑیں تر دو و تذبذب اور شک و شبہ کی تاریکیاں خود بخود چھٹی چلی گئیں اور پھر وہاں ایمان و ایقان کے آفتاب جہاں تازے

اس شان سے طلوع کیا کہ ع

عالم تمام مطلع انوار ہو گیا

لیکن جب سے دنیا کے جھیلوں میں پڑ کر ان کو قرآن حکیم سے بُد ہونا شروع ہوا ان کی روح قومیت بھی درمازہ ہونے لگی اور آج اس کے جو نتائج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں ان کے ماتم میں دیدہ و دل سے جتنا بھی دجلہ خون بہے کم ہے اور جس قدر بھی آہ و فغاں کے شرار سے لب و دہن سے بلند ہوں تھوڑے ہیں۔

قرآن پر عمل سے انحراف اور روگردانی کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ ہمارے زمانہ میں بعض انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب نے فہم قرآن سے متعلق ایک عام غلط فہمی یہ پھیلا دی ہے کہ قرآن وید کی طرح کوئی ایسی کتاب نہیں جس کا علم کسی خاص طبقہ تک محدود ہو۔ بلکہ وہ ایک آسان کتاب ہے اس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ آج ہر شخص اپنی بساطِ علمی اور استعدادِ فکری کے مطابق قرآن کی کسی آیت کے جو معانی چاہتا ہے متعین کر لیتا ہے اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دینے لگتا ہے۔

اس بنا پر اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ان دونوں مسئلوں کی تنقیح کر کے یہ صاف

صاف بتا دیا جائے کہ

(۱) کیا قرآن آسان ہے؟ اور اگر ہے تو اس کی حقیقت کیا ہے؟ کیا وہ عربی کی معمولی شدہ سے سمجھ میں آسکتا ہے اور ہر شخص کو اس سے استخراجِ احکام و استنباطِ مسائل کا حق حاصل ہو سکتا ہے (۲) اور اگر قرآن کے فہم کے لئے صرف عربی کی معمولی استعداد کافی نہیں ہے تو اب یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ اور کون سے شرائط ہیں جن کی تکمیل کے بغیر کسی شخص کو فہم قرآن کا ادعا جائز نہیں اس وقت آپ کے ہاتھوں میں جو کتاب ہے اس کا موضوع انھیں دونوں مسئلوں پر بحث کرنا ہے۔ کلمہ حق اُرید بہ الباطل | جیسا کہ آگے چل کر ہم بتائیں گے قرآن واقعی آسان ہے۔ لیکن اس کی حقیقت وہ نہیں ہے جو آج کل کا ہمارا ایک مخصوص طبقہ سمجھتا ہے۔ ان حضرات کے نزدیک تو قرآن کے آسان ہونے کے معنی یہ ہیں کہ

(۱) قرآن کو سمجھنے کے لئے کسی خاص علم و فن کا حاصل کرنا ضروری نہیں۔

(۲) قرآن سے احکام کا استنباط جس طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کرتے تھے ہم بھی کر سکتے ہیں اور ہم میں اور دوسرے ائمہ تفسیر میں کوئی فرق نہیں ہے۔

(۳) اب تک جو تفسیر لکھی گئی ہیں بیکار ہیں، کیونکہ قرآن تو ایک آسان کتاب ہے، اس کے فہم کے لئے کسی معلم اور راہنما کی ضرورت ہی نہیں۔ ہر شخص ترجمہ دیکھ کر اس کا مطلب خود بخود معلوم کر سکتا ہے۔

پھر ان ہی لوگوں میں اب ایک گروہ پیدا ہوا ہے جو ایک قدم اور آگے بڑھ کر کہتا ہے:-

(۴) فہم قرآن کے لئے حدیث کی بھی ضرورت نہیں۔ قرآن ایک مکمل سرچشمہ ہدایت ہے اسلامی احکام کی تمام کلیات و جزئیات اس میں بیان کر دی گئی ہیں، ان کے ہوتے ہوئے کیا ضرورت ہے کہ احادیث کی روشنی میں قرآن مجید سے احکام مستنبط کئے جائیں۔

ان حضرات کا دعویٰ اور اس پر ان نتائج کی بنیاد کو دیکھ کر ہم حضرت علیؓ کے قول کے مطابق یہی کہہ سکتے ہیں کہ:-

کلمۃ حق ارید بالباطل بات تو سچی ہے لیکن ارادہ باطل چیز کا کیا گیا ہے۔

ادعائے باطل کا اس سبب

لیکن اصل مسئلہ پر گفتگو کرنے سے پہلے اس امر پر متنبہ کر دینا ضروری ہے کہ آپ نے کبھی اس پر غور فرمایا ہے کہ جو بات ساڑھے تیرہ سو برس میں آج تک نہیں کہی گئی وہ

آج کیوں کہی جا رہی ہے۔ مسلمانوں کے دورِ عروج و ارتقا سے لیکر اب تک ہر زمانہ میں برابر یہ دستور رہا ہے کہ جو حضرات فہم قرآن کی سعادت حاصل کرنے کے لئے عمریں صرف کرتے تھے، ملک ملک کی خاک چھانتے تھے، علوم قرآن میں ہی اشتغال رکھتے تھے لوگ ان کو ہی قرآن کے معانی و مضامین پر کلام کرنے کا اہل سمجھتے تھے اور جب بھی کوئی ایسا معاملہ پیش آتا تھا تو انہیں حضرات کی طرف رجوع کیا جاتا تھا یہ کبھی نہیں ہوا کہ ہر شخص کو خواہ وہ قرآن سے اشتغال رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو فہم قرآن کے

شرائط کا جامع ہو یا نہ ہو۔ بہر حال قرآن مجید کے آسان ہونے کے باعث اس کو قرآن کے حقائق و مطالب پر ذمہ دارانہ طور سے کلام کرنے کا اہل سمجھا گیا ہو۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ جو دعویٰ پہلے کبھی نہیں کیا گیا وہ آج کیا جا رہا ہے اور جس چیز کو پہلے کبھی زبان پر نہیں لایا گیا آج ہر بلا اس کی اشاعت کی جا رہی ہے۔ اصل یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد جب انگریزوں نے ہندوستان پر اپنے حاکمانہ قبضہ کی گرفت مضبوط کرنی چاہی تو انھیں یہ محسوس ہوا کہ ہندوستان کی قومیں اور بالخصوص مسلمان کٹر قسم کے مذہبی لوگ ہیں اور اپنے مذہبی تعصب کی بنا پر انگریزوں کی ہر ایک چیز سے نفرت شدید کرتے ہیں اور اسی مذہبی جوش کے باعث ان میں جذبہ جہاد (Fanaticism) بھی بدرجہ اتم موجود ہے، انگریز ہندوستان کو فتح کر چکے تھے لیکن وہ جانتے تھے کہ مسلمان کا جذبہ جہاد ایک شیر کی طرح ہے کہ جب تک وہ اپنی کچھار میں پڑا سوتا رہے کسی چیز کی پروا نہیں کرتا لیکن جب وہ بیدار ہو جاتا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت بھی اس کو خوف زدہ نہیں کر سکتی یہی اندیشہ تھا جس نے انگریزوں کو پریشان کر رکھا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ کوئی ترکیب ایسی چلنی چاہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں انگریزیت کے خلاف جو جذبہ نفرت بھرا ہوا ہے وہ جاتا رہے۔ لیکن اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ مسلمان علمائے کرام کے زیر اثر تھے اور وہ کسی حالت میں بھی انگریز کی ظہارت کا فتویٰ دینے کے لئے تیار نہ تھے۔ اب انھیں محسوس ہوا کہ ان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ علمائے کرام کا ہی وجود ہے، اور یہ ایسی کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہیں ہیں کہ آسانی سے کسی کے نقرئی یا زریں دام فریب میں آسکیں۔ اس بنا پر انھوں نے چاہا کہ کسی طرح علماء کا وقار ختم کر دیا جائے، اور مسلمانوں کے دل و دماغ پر انھوں نے جو تسلط جما رکھا ہے اس کی گرفت کو ڈھیلا کر دیا جائے۔

یہ اس فکر میں تھے ہی کہ انھیں سرسید اور ان کے بعض ہم خیال لوگ مل گئے جنھوں نے "تہذیب الاخلاق" کے نام سے ایک رسالہ نکالنا شروع کیا اور اس میں اپنے مذہبی مضامین کے ذریعہ غریب علماء کا تو ذکر ہی کیا ہے، سرے سے تہذیب کی بساط کھن ہی الٹ کر رکھ دی، آپ

آپ سرسید کے مضامین پڑھئے، ان کے ہم خیال شعراء کی نظمیں دیکھئے، آپ محسوس کریں گے کہ ان میں کس آزادی کے ساتھ علماء کرام پر آوازے کئے گئے ہیں، کیسی کیسی نادر اور نرالی پھبتیاں ان پر چسپت کی گئی ہیں۔ ان لوگوں کو یقین تھا کہ محض سب و شتم سے کام نہیں چلتا۔ اس لئے علماء کے وقار کو ختم کرنے کے لئے انھوں نے ایک اور تدبیر اختیار کی جو شاید پہلی سے زیادہ کامیاب رہی۔ ایک طرف تو انھوں نے کہنا شروع کیا کہ "الدین کیس" دین تو آسان ہے۔ ہر شخص اس کو اپنی اپنی سہولت و آسانی کے مطابق سمجھ سکتا اور اس پر عمل کر سکتا ہے اور دوسری طرف انھوں نے کہا کہ حضور خود فرما گئے ہیں "انتم اعلم بامور دنیا کم" تم اپنی دنیا کی باتوں کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو پھر کبھی انھوں نے اعلان کیا کہ دین ہے ایسا کونسا پیچیدہ معمہ جس کے حل کرنے کے لئے ابو حنیفہؒ یا کسی غزالیؒ و رازیؒ کا دماغ و جانسوزی درکار ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود فرما گئے ہیں مَنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ جس کسی نے لا الہ الا اللہ کہہ لیا جنت میں داخل ہو گیا۔

یہ جتنی باتیں کہی گئیں، الفاظ کی حد تک سب درست تھیں۔ لیکن ان الفاظ کے قالب پر معانی کا جو جامہ چڑھایا گیا، اسلامی تخیل کے نقش سے بالکل معز اور سادہ تھا اور اس پر جبکہ جسگہ اغراض فاسدہ کے سیاہ دھبے پڑے ہوئے تھے، اس طرح کی باتیں کہہ کہہ کر مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ دین اور قرآن کوئی مشکل چیز نہیں ہے۔ ہر شخص خواہ عربی کا عالم ہو یا نہ ہو اسے سمجھ سکتا ہے اور اس کے احکام معلوم کر سکتا ہے۔ اس لئے علماء کا جو وصف ماہہ الاتیاز سمجھا جاتا ہے وہ ایک بے بنیاد چیز ہے۔ انگریز اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا اور آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو علماء اسلام کی ایک جماعت حقہ سے نفرت دلا کر کس اطمینان خاطر کے ساتھ ہندوستان پر حکومت کر رہا ہے۔

دراصل یہ ہے تاریخ اس طرح کے پروپیگنڈے کی اور یہ جو کچھ کہا جا رہا ہے کوئی نئی بات نہیں، بلکہ ایک نوائے قدیم کی صدائے بازگشت ہے جو کچھ دنوں کے لئے خاموش ہو گئی تھی، مگر اب بعض مصلح کی خاطر سیاست کے حدی خواں نے پھر اس نعمتہ کارواں کو گانا شروع کر دیا ہے۔

اب آئیے اصل مسئلہ کی تحقیق کریں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ معلوم کر لینا چاہئے کہ قرآن آسان ہے یا نہیں اگر آسان ہے تو اس کی حقیقت اور اس سے مراد کیا ہے؟

قرآن کے آسان | اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن نے اپنے تئیں خود آسان کہا ہے۔
ہونے کا مطلب ارشاد ہے۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ
فَهَلْ مِنْ مُدَّاكِرٍ (القمر)

اور تحقیق ہم نے قرآن مجید کو سہل کر دیا تاکہ لوگ اس سے نصیحت حاصل کریں تو کیا کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا؟

یہ آیت مسورۃ القمر میں متعدد بار آئی ہے۔ سورۃ کے شروع میں قیامت کا ذکر ہے اور ان لوگوں پر شدید نفرت کا اظہار کیا گیا ہے جو اپنی خواہشات کی پیروی میں دن رات مشغول رہتے ہیں اور داعی حق کی آواز کو بالکل نہیں سنتے، پھر علی الترتیب، قوم نوح، عاد، ثمود اور قوم لوط کی نافرمانی و سرکشی اور قہر الہی سے ان کے تباہ و برباد ہو جانے کا بیان الگ الگ ایسے انداز میں کیا گیا ہے جس کو سن کر سخت سے سخت منکر کا بھی دل لرز جائے اور ہر واقعہ کے ذکر کے بعد بطور تشبیہ دریافت کیا گیا ہے۔

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ الْآيَةِ (دیکھو) میرا عذاب دینا اور ڈرانا ان کے حق میں) کس طرح پورا ہوا
فَهَلْ مِنْ مُدَّاكِرٍ (القمر) پس کیا کوئی ہے (اس سے) نصیحت حاصل کرنے والا؟

اور مذکورہ بالا آیت میں نصیحت حاصل کرنے کے لئے قرآن کی آسانی اور سہولت کو بیان فرما کر اس سے سبق لینے کی دعوت دی گئی ہے۔
ایک اور موقع پر سورہ مریم میں ارشاد ہے۔

فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ
لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ وَ
تُنذِرَ بِهِ قَوْمًا لُدًّا -

اور تحقیق ہم نے قرآن مجید کو تمہاری زبان میں آسان کر دیا ہے تاکہ تم اس کے ذریعہ پرہیزگاروں کو بشارت سناؤ اور جھگڑالو قوموں کو ڈراؤ دھمکاؤ۔

قرآن ہدایت و نصیحت
کی کتاب ہے۔

لیکن ان دونوں آیتوں کے نفس مطلب اور ان کے سیاق و سباق پر غور کیجئے
تو یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید کی زبان میں اس کے آسان

ہونے کے کیا معنی ہیں؟ پہلی آیت کا سباق اور اس کا ماقبل سے ربط آپ کو معلوم ہو چکا، اس سے
صاف طور پر یہی بتا دیتا ہے کہ قرآن مجید رشد و ہدایت کی آسان کتاب ہے، اس میں
عبرت و بصیرت کے لئے جگہ جگہ اقوام کہن کے واقعات کا بیان ہے اور خدا کے وجود حق کو
ثابت کرنے کے لئے قدرت کی ایسی واضح نشانیاں بتائی گئی ہیں جن کا ایک ایک ذرہ مبرا
فیاض کے وجود و ثبوت اور اس کی قدرت بے مثال کا زبان حال سے اعلان کر رہا ہے، یہ سب
باتیں ان کو قرآن مجید سے ہی معلوم ہوتی ہیں اس لئے اس عالم کون و خساد میں ہدایت کا سرچشمہ
قرآن مجید ہی ہوا تو کیا پھر کوئی ہے جو اس سے موعظت گیر ہو اور نصیحت حاصل کرے؟

پانی کا برسا، برق کی چمک، رعد کی گرج، دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن کا آنا
آفتاب کا مشرق سے طلوع کرنا اور مغرب میں غروب ہو جانا، موسموں کا تغیر و تبدل، انسان کا
عدم سے وجود میں آنے کے لئے کن کن مراحل سے گذرنا، چشموں کا اُبلنا، کھیتوں کا سرسبز و شاداب ہونا
پتھروں سے پانی کا پھوٹ کر نکلنا اور اونٹ کی عجیب و غریب خلقت اور اسی طرح کی وہ سیکڑوں
نشانیاں جو قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ ایک انسان بار بار ان کو دیکھتا ہے لیکن اس کا ذہن ان کے صانع و
خالق کی طرف منتقل نہیں ہوتا۔ قرآن حکیم انتہائی فصیح و بلیغ پیرایہ بیان میں ان کا ذکر کرتا ہے،
اور لوگوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ ان سب چیزوں کے اصل منشا اور باعث اور ان کی علت
فاعلہ پر غور کریں۔ ظاہر ہے یہ چیزیں مشاہدات سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کا دیکھنا، سمجھنا
ان سے خدا کے وجود پر استدلال کرنا، چنداں مشکل و دشوار نہیں، ضرورت صرف اس کی ہے
کہ آدمی اس کی طرف متوجہ ہو۔ پس اسی بنا پر قرآن مجید نے اپنے تئیں آسان کہا ہے
اور یہی وجہ ہے کہ یُسِرِ الْقُرْآنَ کا ذکر کر کے لَلذِّكْرِ سِنِي نَصِيحَتِ كَلِمَةٍ فرمایا گیا ہے، اور پھر
ارشاد ہوا فَهَلْ مِنْ مَّدْرَسٍ؟

سورہ القمر کی آیت کے علاوہ سورہ مریم کی جو آیت اوپر مذکور ہوئی ہے اس کا مطلب بھی یہی ہے چنانچہ فرمایا گیا ہے۔

لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ وَ
تُنذِرَ بِهِ قَوْمًا لَدُنَّا أَرْمِمْ
ہم نے قرآن کو اس لئے آسان کیا ہے کہ آپ اس کے ذریعہ پرہیزگاروں کو
کو خوشخبری سنائیں اور جھگڑالو لوگوں کو ڈرائیں۔

مقصود یہ ہے کہ قرآن مجید میں ترغیب و ترہیب سے متعلق جو باتیں بیان کی گئی ہیں وہ اس قدر صاف و واضح اور روشن ہیں کہ وہ لوگ جن کے دل میں عناد و تعصب کے شعلے نہیں بھڑک رہے ہیں، ان کو سن کر شاد کام فلاح ہو جائیں گے اور جو فطرط عداوت سے انکار و جھوڑ کی قسم کھا بیٹھے ہیں ان کو قرآن کی آیات و وعید سن کر تائب ہوگا اور وہ سمجھیں گے کہ جو قادی مطلق عا دو نمود کی سرکش قوموں کو صفحہ ہستی سے بے نام و نشان کر سکتا، اور قوم لوط پر تپھروں کی بارش کر کے انھیں مسمار کر سکتا ہے وہ ان سرکشوں کے ساتھ بھی اگر چاہے تو یہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

بہر حال قرآن مجید کے سہل ہونے کے معنی یہی ہیں کہ اس کی تعلیمات آسان ہیں، وہ جن حقائق کی طرف لوگوں کو متوجہ کرتا ہے وہ فلسفہ کے مسائل و مباحث کی طرح پیچیدہ نہیں بلکہ ہر ایک پر واضح ہیں۔ پھر ان پر عمل کرنا بھی دشوار نہیں۔ کیونکہ قرآن کی راہ اصل فطرت کی راہ ہے اور اس کی روش وہی ہے جس کی طرف ہر انسان کی فطرت سلیمہ دعوت دیتی ہے مثلاً نماز پڑھو، روزہ رکھو، حج کرو، والدین اور اعزاء و اقربا کے ساتھ احسان و کرم کا معاملہ کرو، شراب نہ پیو، زنا سے بچو، وعدہ پورا کرو، بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی سے پیش آؤ۔ یہ وہ احکام ہیں جن کو ایک عربی دان جس طرح سمجھ سکتا ہے ایک غیر عربی دان بھی اردو یا کسی اور زبان میں ترجمہ دیکھ کر معلوم کر سکتا ہے۔

فہم قرآن سے مراد | لیکن سوال یہ ہے کہ "فہم قرآن" کے معنی کیا ہیں کہ قرآن مجید کو پڑھ کر بعض چیزوں کے متعلق حسن و قبح کے احکام معلوم ہو جائیں اور بس۔ اگر واقعی یہی مراد ہے تو پھر ہمیں اختلاف کی کوئی ضرورت نہیں۔ مگر ظاہر ہے یہ مراد نہیں ہے، بلکہ فہم قرآن سے غرض یہ ہے

کہ انسان مجتہدانہ طور سے احکام کا استنباط کر سکے، قرآن کی کسی آیت کو پڑھ کر اس کے واقعی اور حقیقی مفہوم کو متعین کر سکے اس کے معیار بلاغت و دریافت کر کے یہ سمجھ سکے کہ یہاں کلام کا مقضیٰ حال کیا ہے اور کس چیز پر زیادہ زور دینا منظور ہے اس کا مدلول مطابق اور مدلول التزامی کیا ہے اور یہاں کیا مراد ہے تو یہ بات یقینی ہے کہ اس مراد و غرض کے اعتبار سے فہم قرآن کسی ترجمہ کے دیکھ لینے سے حاصل نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لئے خاص شرائط و آداب ہیں کہ جب تک وہ نہ پائے جائیں کوئی شخص فہم قرآن کا مدعی نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ مفتی محمد عبدہ المصری بیان کرتے ہیں۔

تفسیر کے چند مراتب ہیں۔ ادنیٰ مرتبہ یہ ہے کہ اجمالاً وہ چیز بیان کر دی جائے جو قلب کو اللہ کی عظمت اور اس کے تقدس کے احساس سے پُر کر دے اور نفس کو شر سے روک کر خیر کی طرف لے آئے یہی بات ہے جس کی بنا پر ولقد یسرنا القرآن للذکر فهل من مدکر کا مرثوہ جانفزاہم کو سنایا گیا ہے۔ لیکن اس مرتبہ سے تجاوز کر کے اگر کوئی شخص تفسیر کا مرتبہ علیا حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ بغیر چند امور کے حاصل نہیں ہوتا۔

دور کیوں جائے خود قرآن کو دیکھئے۔ اس نے جہاں اپنے آپ کو نصیحت کے لئے آسان کہا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ سب آیات یکساں نہیں ہیں بلکہ مراد کے واضح اور مخفی ہونے کے اعتبار سے ان میں باہمی فرق بھی ہے۔ ارشاد ہے۔

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ
 آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخْرَى مُتَشَابِهَاتٌ
 وہ خدا ہی ہے جس نے آپ پر کتاب اتاری
 اس کی بعض آیتیں عام فہم ہیں وہی کتاب کی
 اصل ہیں اور دوسری کئی پہلو والی ہیں۔

پھر اس کے بعد فرمایا گیا۔

فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ
 فَيَتَّبِعُونَ فَأَتَتْهُمْ شِقَاؤُهُمْ
 پس جن لوگوں کے دل میں کجی ہے وہ فتنہ کی
 جستجو اور اصل حقیقت معلوم کرنے کی غرض سے

الْفِتْنَةَ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ، وَمَا يَعْلَمُ
 تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ
 فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ
 مِّنْ عِندِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا
 أُولُو الْأَلْبَابِ - (دین)

کتاب میں سے ان آیات کے پیچھے پڑتے ہیں جن
 میں کسی پہلو نکلنے میں حالانکہ ان آیات کی اصل
 حقیقت صرف اللہ اور علماءِ راشدین جانتے ہیں
 جبکہ وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لے آئے سب کچھ
 ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے اور نصیحت تو عقل مند

ان دونوں آیتوں سے صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں بعض آیات ایسی
 بھی ہیں جن کی مراد اللہ کے سوا صرف علماءِ راشدین کو معلوم ہو سکتی ہے۔ ہر شخص خواہ عالمِ راسخ ہو
 یا نہ ہو ان آیات کی مراد تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔

قرآن احکام و مسائل | علاوہ بریں یہ بات بھی نہ بھولنی چاہئے کہ قرآن مجید صرف امثالِ قصص کی
 کی کتاب ہے | کتاب نہیں ہے بلکہ وہ شخصی اور اجتماعی زندگی کا ایک مکمل دستور العمل بھی
 ہے جس کے بعد کوئی اور آسمانی کتاب نازل نہیں ہوگی۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ اس کتاب الہی
 میں زندگی کے تمام مسائل کے لئے جزئی تفصیلات مذکور نہیں ہیں اور حق یہ ہے کہ چونکہ ہر زمانہ
 میں انسانی عقل و شعور کی استعداد اور صلاحیت یکساں نہیں ہوتی بلکہ اس میں عمل اور تقابیر برابر
 جاری رہتا ہے۔ اس بنا پر حکمتِ خداوندی کا اقتضا یہی ہونا چاہئے تھا کہ آخری کتابِ سماوی
 میں زندگی سے متعلق صرف اصول بیان کئے جائیں اور ان کی جزئیات سے تعرض نہ کیا جائے
 پس جب قرآن میں جزئیات نہیں اور صرف اصول و کلیات کا تذکرہ و بیان ہے
 تو اب لامحالہ فہم قرآن کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہونا چاہئے کہ اصول سے فروع اور کلیات سے
 جزئیات کے استخراج و استنباط کی صلاحیت و استعداد ہو۔

اس بیان سے یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ چونکہ استنباطِ مسائل اور استخراجِ احکام
 میں سب لوگ یکساں صلاحیت و استعداد کے مالک نہیں ہو سکتے اس بنا پر ان میں بھی باہمی
 فرق مراتب ہوگا۔

صحابہ فہم قرآن میں | یہی وجہ ہے کہ ہم عجمیوں اور خیر القرون سے اس درجہ بعد رکھنے والوں کا کیا
ذکر؟ خود صحابہ کرام جو بلا واسطہ غیر نبوت کی زبان حق تر جان سے
برابر نہیں تھے

قرآن مجید سنتے تھے، اہل لسان و صاحب زبان تھے اور جن کے سینے آفتاب جہاں تاب
رسالت کی شعاعوں سے براہ راست منور تھے۔ فہم قرآن کے مرتبہ میں یکساں حیثیت کے مالک
نہیں تھے۔ تمام صحابہ میں صرف چھ یاسات تھے جو قرآنی حقائق کی توضیح میں مستند مانے جاتے
تھے۔ ان حضرات کے اسماء گرامی یہ ہیں۔ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، ابن مسعودؓ، ابن عمرؓ، ابن عباسؓ
زید بن ثابت اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم اجمعین۔ مسروق جو کہ ایک مشہور تابعی مفسر ہیں
فرماتے ہیں۔

”میں نے صحابہ کرام سے فیض صحبت اٹھایا تو میں نے دیکھا کہ ان کا علم چھ بزرگوں کی طرف

لوٹتا ہے حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، عبد اللہ بن مسعودؓ، معاذ، ابوالدرداءؓ، اور زید بن ثابتؓ۔

پھر عجیب بات یہ ہے کہ فہم قرآن میں ان چھ یاسات حضرات کا مرتبہ بھی یکساں نہیں
تھا۔ یہی مسروق آگے چل کر بیان کرتے ہیں، میں نے ان چھ بزرگوں سے شرف صحبت حاصل
کیا تو دیکھا کہ ان سب کا علم علیؓ اور عبد اللہؓ پر ختم ہو گیا ہے۔

زید بن عیرۃ السکلی حضرت معاذ بن جبل کے شاگرد تھے۔ فرماتے ہیں جب حضرت
معاذؓ کی وفات ہونے لگی تو انھوں نے مجھ کو حکم دیا کہ میں علم صرف چار بزرگوں سے حاصل کروں
عبد اللہ بن مسعودؓ، عبد اللہ بن سلامؓ، سلمان الفارسیؓ، اور ابوالدرداءؓ۔

بعض خاص خاص صحابہ کا | صحابہ کرام میں جو حضرات تفسیر قرآن کی خدمت انجام دیتے تھے ان
ذوق قرآن فہمی کے حالات و اقوال پر نظر ڈالی جائے تو ان میں ایک اور حیثیت سے بھی

فرق نظر آئے گا۔ حضرت عمرؓ کا رو بار خلافت کو انجام دیتے تھے، فتوحات ممالک اور سیاسی امور
کی نگرانی کا کام کرتے تھے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ نہ تو احادیث آپ سے زیادہ تعداد میں مروی ہیں

۱۔ طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۱۰۲۔ ۲۔ الاتقان فی علوم القرآن (بیوٹی)

اور نہ قرآن مجید کی تفسیر سے متعلق ہی آپ کے اقوال کثرت سے دیکھنے میں آتے ہیں لیکن دراصل وہ حریم اسلام کے بہترین محرم راز تھے اور ان کی فطرت و طبیعت کو اسلام اور قرآن مجید کی تعلیمات و احکام کے ساتھ ایک رازدارانہ نسبت تھی۔ حضرت ابوذرؓ فرماتے تھے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔

ان الله وضع الحق على لسان
عمر يقول به
الله تعالى نے حق کو عمر کی زبان پر رکھ دیا ہے
جس کو وہ کہتے ہیں۔

لیکن ان کی فہم عقل قضائی تھی یعنی جہاں تک اسلامی احکام کا تعلق ہے حضرت عمرؓ کا فیصلہ ایک بڑی حد تک شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کے منشاء سے قریب ہوتا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ رہی یہ بات کہ اس حکم کی حکمت اور اس میں رمز کیا ہے تو غالباً اس معاملہ میں کی رمز شناسی حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت عمرؓ پر فوقیت رکھتے ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق دعا کی تھی۔

اللهم فقهم في الدين
لے اللہ تو ابن عباس کو دین میں نظر فقہ عطا فرما۔

بعض روایتوں میں بجائے فقہم فی الدین کے عَلِمَهُ التَّوْبِيلُ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اے اللہ تو قرآن مجید کی آیات کا صحیح مصداق ابن عباس کو بتا دے! لے

حضرت ابن عباسؓ، حضرت عمرؓ کے برخلاف سیاسی کاموں میں حصہ نہیں لیتے تھے، اردے زیادہ محتاط تھے۔ دن رات تعلیم و تعلم اور تدریس و تدریس میں بسر کرتے تھے۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث عموماً انصار کے پاس تھیں، میں حدیث کی جستجو میں کسی انصاری کے پاس آتا اور اس کو دروازے پر سوتا ہوا پاتا تو وہیں دروازے پر بیٹھ جاتا تھا، ہواؤں کے تھپڑے مجھ کو پریشان کرتے تھے۔ آخر کار بیدار ہونے کے بعد جب میں وہ روایت سن لیتا تو واپس چلا آتا تھا، اس انہماک و مشغولیت کے علاوہ حضرت ابن عباسؓ شعر جاہلیت، انساب اقوام، اور تاریخ

عرب سے پورے واقف تھے۔ حضرت عمرؓ بھی ابن عباسؓ کی یہ خصوصیت تسلیم کرتے تھے اور جب کبھی انھیں قرآن مجید کے کسی لفظ میں اشکال پیش آتا تو وہ حضرت ابن عباسؓ کی طرف ہی رجوع کرتے چنانچہ ایک مرتبہ قرآن مجید کی سورہ عبس میں جو لفظ "ابا" آیا ہے اس کے معنی کے متعلق چند صحابہ میں اختلاف ہوا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا "چلو ابن عباسؓ کے پاس چلیں وہ ہم سب سے زیادہ لغت عرب کے جاننے والے ہیں"۔

حضرت مجاہدؒ سے مروی ہے کہ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ارشاد فرمایا "نعم ترجمان القرآن انت" عبداللہ بن مسعود کا قول تھا "نعم ترجمان القرآن عبد اللہ بن عباس"۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس ایک شخص آیا اور پوچھا کہ وہ آسمان اور زمین کو نے میں جن کی نسبت فرمایا گیا ہے "کانتارتقا ففتقنہما" ابن عمرؓ نے اس شخص کو خود کچھ جواب نہیں دیا۔ بلکہ ارشاد ہوا "ابن عباسؓ کے پاس جاؤ اور ان سے اس کے متعلق دریافت کرو، پھر مجھ سے آکر اسے کہہ جانا۔ حضرت ابن عباسؓ کے پاس وہ شخص آیا۔ تو آپ نے جواب دیا "آسمانوں کا رقیق تو یہ ہے کہ ان سے بارش نہیں ہوتی تھی اور زمینوں کا رقیق یہ تھا کہ ان میں ویدگی نہیں پائی جاتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فتق کر دیا تو آسمانوں سے بارش ہونے لگی اور زمینوں میں نباتات پیدا ہونے لگیں"۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے۔ ایک دفعہ اذا جاء نصر اللہ والفتح کے متعلق صحابہ میں اختلاف ہوا۔ لوگوں نے حضرت عمرؓ سے پوچھا "آپ کیا فرماتے ہیں۔ انھوں نے کہا "میں وہی جانتا ہوں جو ابن عباسؓ جانتے ہیں"۔

135440

۱۔ الاتقان ج ۱ ص ۱۱۳۔ ۲۔ یہ سب روایات الاتقان ج ۲ باب طبقات المفسرین سے لی گئی ہیں۔

۳۔ لیکن یہ بات خاص طور پر لحاظ کے قابل ہے کہ اس علم و فضل کے باوجود خود حضرت ابن عباسؓ قرآن مجید کے بعض الفاظ کے معنی اور فرائض سے معلوم کرتے تھے۔ ایک روایت میں وہ خود فرماتے ہیں کہ میں فاطر السموات کے معنی نہیں جانتا تھا۔ ایک مرتبہ اتفاق سے دو عربی ایک کنوئیں پر چھبڑتے ہوئے میرے پاس آئے۔ ان میں سے ایک بولا "انا فطر تھا" میں نے یہ کتواں سب سے پہلے کھو دا ہوں اعرابی کے یہ کہتے ہی فاطر السموات کی مراد میری سمجھ میں آگئی۔ ذائقہ حاشیہ صفحہ ۲۲ پر

یہ اور اس طرح کے سیکڑوں آثار ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل زبان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شرف صحبت سے سرفراز ہونے میں یکساں وہم رتبہ ہونے کے باوجود تمام صحابہ کرام قرآن میں یکساں نہیں تھے۔ بلکہ ان میں بعض خاص خاص صحابہ ہی ایسے تھے جو درحقیقت ذمہ دارانہ طور پر تفسیر قرآن کی خدمت انجام دے سکتے تھے اور ان کی اس خصوصیت کو اجلہ صحابہ بھی تسلیم کرتے تھے۔ ان کی اس برتری اور فضیلت کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں تھی کہ وہ ذوق قرآنی جو محض ایک عطیہ خداوندی ہے ان کو دوسروں کی بہ نسبت زیادہ افراط کے ساتھ مرحمت ہوا تھا۔

وذلك فضل الله يؤتيه من يشاء۔

تفسیر قرآنی میں ہمارے زمانہ میں ہر شخص جو عربی کی معمولی شد بدرکتاب ہے قرآن کے حقائق و مطالب اسلاف کی احتیاط پر کلام کرنے کا اپنے تئیں مستحق سمجھتا ہے اور ائمہ تفسیر کے عام بیانات کے برخلاف اس کو خود اپنی طرف سے جدت بیانی کرتے ہوئے کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا۔ لیکن آپ کو شاید یہ شکر تعجب ہو کہ عہد صحابہ و تابعین میں یہ جبارت عام نہیں تھی جیسا کہ ابھی معلوم ہوا۔ ان جماعتوں میں خاص خاص حضرات تھے جو قرآن مجید کی تفسیر بیان کرتے اور کر سکتے تھے۔ اور ان مباحث و مطالب میں وہ مرجع قوم و ملت سمجھے جاتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود یہ حضرات بھی تفسیر قرآن کے معاملہ میں حد درجہ احتیاط ہی رکھتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں "میں نے مدینہ طیبہ کے فقہار کو دیکھا ہے۔ یہ حضرات تفسیر قرآن کے سلسلہ میں گفتگو کرنے کو بڑا اہم اور ذمہ داری کا کام سمجھتے تھے۔ سالم بن عبداللہ، قاسم بن محمد، سعید بن مسیب اور حضرت نافع ان ہی حضرات میں سے تھے"۔

یہی بن سعید کا بیان ہے کہ میں نے ایک شخص کو دیکھا سعید بن مسیب سے قرآن مجید

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲)

علاوہ بریں بعض الفاظ ایسے بھی تھے جن کی مراد حضرت ابن عباسؓ کو معلوم نہیں ہو سکی۔ خود ان کا بیان ہے "قرآن میں چار الفاظ کے معنی مجھ کو دریافت نہیں ہو سکے۔ غنیلین۔ حنان۔ آواہ۔ رقیہ۔ (الائقان ص ۱۱۳)۔

سہ تفسیر ابن جریر ص ۲۸۔

کی کسی آیت کی نسبت دریافت کر رہا تھا۔ مگر آپ نے جواب دیا "میں قرآن سے متعلق کچھ نہیں کہوں گا۔" ۱۷

حضرت شعبی فرماتے تھے "تین چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلق میں مرتے دم تک کچھ نہیں کہہ سکتا۔ قرآن، روح اور قیاس" ۱۸

اصحیحی کو کون نہیں جانتا، لغت و ادب کا کتنا بڑا امام تھا۔ برسوں تحقیق لغات، صحیح محاورات اور ان کے معانی کی فکر میں عرب کے جنگلوں کی خاک چھانتا پھرا ہے اور لفظ لفظ کے لئے عرب کے بدوقوں میں برسوں تک قیام کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود قرآن مجید کی تفسیر میں بالکل خاموش رہتا تھا۔ اس سے کسی آیت کی نسبت دریافت کیا جاتا تو کہتا "عرب اس کے یہ معنی بیان کرتے ہیں میں نہیں جانتا اس سے کیا مراد ہے؟" ۱۹

ابوطیب کہتا ہے "اصحیحی بجد خدا پرست تھا وہ قرآن کی کسی آیت کی تفسیر نہ کرتا تھا"

اس درجہ احتیاط کا | غور کیجئے! آخر وہ کونسی بات تھی جس کی وجہ سے یہ اکابر علم و ادب اور ائمہ عربیت و لغت بھی قرآن مجید سے متعلق گفتگو کرنے میں اس درجہ احتیاط کرتے

تھے۔ اس کی وجہ بجز اس کے اور کیا ہے کہ یہ حضرات تفسیر قرآن کی اہم ذمہ داری کا کامل احساس رکھتے تھے اور تفسیری اہلیت پیدا کرنے کے لئے جن صفات و اوصاف کی ضرورت ہے یہ حضرات ان میں خواہ کیسا ہی مرتبہ کمال رکھتے ہوں۔ تاہم انہیں تفسیر قرآن کی عظیم الشان ذمہ داری کے پیش نظر اپنے متعلق پورا بھروسہ نہیں ہوتا تھا اور اس بنا پر اس باب میں جہالت سے کام لیتے ہوئے ان کو تردد ہوتا تھا اور حتی الوسع وہ اس سے سبکدوش رہنا چاہتے تھے۔

تفسیر بالرائے پر وعید | اس موقع پر یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ بعض لوگ صحابہ کی اس احتیاط کا اور اس کا مطلب | سبب ان احادیث و آثار کو بتاتے ہیں جن میں اپنی رائے سے قرآن مجید کے

بارہ میں کلام کرنے سے منع کیا گیا ہے یہ شدید قسم کی غلط فہمی ہے جس کے ازالہ کے لئے ہم ذیل میں

یہ روایتیں نقل کرتے ہیں اور پھر ان کا مطلب لکھیں گے۔

ان احادیث میں سب سے زیادہ مشہور وہ روایت ہے جو ابوداؤد، ترمذی، اور نسائی میں ہے اس روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

من تکلم فی القرآن بغیر علم جو شخص علم کے بغیر قرآن کے بارہ میں کچھ کہتا ہے اس کو
فلیتبو مقعدہ من الناس چاہئے کہ دوزخ کو اپنا ٹھکانہ بنالے۔

ابوداؤد سے ایک اور روایت اسی مضمون کی مذکور ہے جس میں بجائے تکلم کے قال ہے دونوں کا حاصل ایک ہی ہے۔ اسی طرح کی ایک روایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے انھیں لفظوں سے مروی ہے جو ابن جریر ج ۱ ص ۲۶ پر مذکور ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یہ قول بھی اس سلسلہ میں بہت مشہور ہے۔

ای ارضی تغلنی وای سماء مجھ کو کون سی زمین اٹھائیگی اور کون سا آسمان
تظلنی اذا قلت فی القرآن مجھ پر سایہ گستر ہو گا جبکہ میں قرآن میں وہ بات
مالا اعلم (ابن جریر ج ۱ ص ۲۶) کہوں جسے میں نہیں جانتا۔

لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ قرآن مجید کے معانی میں غور و خوض اور اس سے احکام و مسائل کا استنباط ہی سرے سے ممنوع کر دیا گیا ہے کیونکہ قرآن نے خود جگہ جگہ اپنی آیات میں غور و تدبر کی دعوت دی ہے اور ان لوگوں کی تعریف کی ہے جو ان میں اہماک رکھتے اور قرآن کے حقائق پر غور کرتے ہیں ارشاد ہے۔

کتاب انزلناہ الیک مبارکاً یہ وہ مبارک کتاب ہے جو ہم نے آپ کی طرف نازل
لینا بڑی آیاتہ ولینتدکرن کی ہے تاکہ لوگ اس کے آیات میں تدبر کریں اور عقلمند
اولوا الالباب۔ اس سے نصیحت پذیر ہوں۔

اس کے بالمقابل جو لوگ قرآن مجید میں تدبر نہیں کرتے ان کی مذمت کی گئی ہے فرمایا گیا ہے

افلا ینتدبرون القرآن کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے یا دلوں پر تالے

أَمْرًا عَلَى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا۔
پڑے ہوئے ہیں۔

اس بنا پر جس حدیث میں قرآن مجید کے متعلق علم کے بغیر گفتگو کرنے کی ممانعت کی گئی ہے اس کا مطلب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ جو لوگ فہم قرآن کا سلیقہ نہیں رکھتے یعنی اس کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے اور جو فہم قرآن کے باب میں مبادی اور اصول موضوعہ کا حکم رکھتی ہیں وہ ان سے بے خبر ہیں۔ ان لوگوں کو محض قیاس و تخمین سے قرآن مجید کے احکام و مسائل یا حقائق و معانی کے بارہ میں گفتگو کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔

غور کیجئے دونوں روایتوں میں ”بغیر علم“ کے الفاظ ہیں۔ اس بنا پر روایت کا مطلب یہی ہو گا کہ جو لوگ نہ جاننے کے باوجود قرآن کے بارہ میں آزادی کے ساتھ لاابالیانہ انداز میں گفتگو کرتے ہیں وہ اللہ کی وعید کے مستحق ہیں۔ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ اس بنا پر اس قدر شدید وعید کی گئی ہے ورنہ ہر شخص جانتا ہے کہ بغیر علم کے ایک قرآن کیا۔ کسی مسئلہ پر بھی گفتگو کرنا شیوہ دانشمندی سے بعید ہے ایک عام اور مشہور شعر ہے۔

آں کس کہ نداند و بداند کہ بداند درجہلِ مرکب ابدالہ ہر باند
فہم قرآن کے شرائط

بات ذرا طویل ہو گئی۔ بہر حال اب یہ حقیقت ذہن نشین ہو گئی ہوگی کہ فہم قرآن کا معاملہ ایسا آسان نہیں ہے کہ ہر شخص خواہ اہل ہویا نہ ہو کلام الہی کی نسبت طبع آزمائی کرنے لگے۔ لامحالہ دنیا کے عام قاعدہ و قانون کے مطابق اس کے لئے بھی کچھ شرائط اور اصول ہوں گے جن کو حاصل کر لینے کے بعد ہی ایک شخص قرآن مجید میں غور و تدبر اور فکر و تامل کا اہل ہو سکتا ہے۔ اب ہمیں انہیں امور پر غور کرنا ہے جن کے بغیر فہم قرآن کی سعادت کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ بنیادی

۱۔ علامہ سید محمود آلوسی نے ابو داؤد، ترمذی اور نسائی کی ان روایتوں پر اسناد کی حیثیت سے کلام کیا ہے اور المسد خلی کے حوالہ سے ان کو ضعیف کہا ہے۔

(روح المعانی ج ۱ ص ۶)

لیکن جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا۔ اگر ان روایتوں کو صحیح مان لیا جائے تب بھی ان سے مطلقاً حکم فی القرآن کی ممانعت ثابت نہیں ہوتی۔

طور پر یہ چیزیں دو قسم کی ہیں۔ ان میں سے ایک کا تعلق علوم و فنون سے ہے جو کتب و کتاب سے حاصل ہوتی ہیں اور دوسری قسم کی چیزوں کا تعلق عمل اور کردار سے ہے۔ اب ہم ان دونوں کو کسی قدر تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

عربیت | قرآن کو سمجھنے کے لئے پہلی اور ابتدائی شرط عربیت ہے کیونکہ ظاہر ہے قرآن عربی میں نازل ہوا۔ اور اس کے اولین مخاطب عرب ہی تھے۔ قرآن میں خود متعدد مواقع پر اس کا اظہار کیا گیا ہے۔

(۱) اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا۔ ۱۱ ہم نے اس کتاب کو عربی قرآن بنا کر نازل کیا ہے۔

(۲) وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَاهُ حِكْمًا عَرَبِيًّا۔ ۱۲ اسی طرح ہم نے اس کو عربی میں حکم بنا کر اتارا ہے۔

(۳) بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ۔ ۱۳ کھول کر بیان کر نیوالی عربی زبان میں اتارا ہے۔

(۴) اِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۔ ۱۴ تاکہ تم سمجھو۔

(۵) فَاَمَّا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ۔ ۱۵ ہم نے اس کو تیری زبان میں آسان کر دیا تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔

(۶) وَهٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا۔ ۱۶ اور یہ ایک کتاب ہے جو پہلی کتابوں کی تصدیق کر نیوالی ہے اور عربی زبان میں ہے۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ عربیت سے مراد عربی زبان کی صرف اتنی استعداد نہیں ہے جو ذوق لسانی کہ کوئی شخص عربی سے اردو میں یا کسی اور زبان میں ترجمہ کر سکے۔ صرف اتنی استعداد سے ایک شخص قرآن کی اجمالی مراد تو سمجھ سکتا ہے لیکن جب تک اس کا ذوق عربیت پختہ نہیں ہوگا اور امام شافعی کے بقول جب تک اس میں کسی عربی عبارت کو عربی کے ہی انداز فہم و تعبیر کے مطابق سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوگی وہ قرآن مجید کے بلیغ اسلوب بیان اور اس کے مخصوص انداز تعبیر سے واقف نہیں ہو سکیگا اور اس بنا پر قرآنی مفہوم و مطلب کے بہت سے گوشے اور پہلو ایسے ہوں گے جو اس کے

عقل و فہم کی گرفت میں نہ آسکیں گے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ یہ کوئی عربی کی ہی خصوصیت نہیں ہے بلکہ ہر زبان کا یہی قاعدہ ہے کسی زبان کو جاننے اور بولنے والے سب کے سب یکساں نہیں ہوتے۔ وہی ایک سادہ سافقرہ اور جملہ ہوتا ہے کہ ایک عامی اور بد ذوق اردو داں اسے سنتا ہے اور اس پر خاک اثر نہیں ہوتا۔ لیکن ایک صاحب ذوق اسے سنتا ہے تو بے اختیار ہو کر سر دھننے لگتا ہے۔ اور اس جملہ میں اس کو حقائق و معانی کا ایک دفتر نظر آتا ہے۔ استاد مومن کا یہ شعر

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

کتنے لوگوں نے پڑھا ہوگا لیکن مرزا غالب نے سنا تو کہنے لگے اے کاش! مومن یہ ایک شعر مجھے دیدیتے اور اس کے عوض میں میرا پورا دیوان مجھ سے لے لیتے۔

عربی ادب کی عام کتابوں میں ہے کہ ایک مرتبہ عربی لغت و ادب کا مشہور امام "اصمعی" نے ایک لڑکی سے سنا یہ دو شعر پڑھ رہی تھی۔

استغفر الله لذنبی کُلِّهٖ قَتَلْتُ اِنْسَانًا بِغَيْرِ حِلِّهٖ

مثل غزالٍ ناعٍ عِرْفِي ذَلِيهٖ وَاَنْتَصَفَيْتِ اللَّيْلَ وَلِمَا صَلَّهٖ

ترجمہ: میں خدا سے اپنے تمام گناہوں کی معافی طلب کرتی ہوں کہ میں نے ایک انسان کو

بغیر جواز کے قتل کر دیا۔ میں ایک خوش عیش بہن کی طرح ناز و انداز میں رہی۔ رات

آدھی ہو گئی اور میں اس سے نہیں ملی۔

اصمعی نے یہ شعر سن کر کہا "اوہو! تم کس قدر فصیح و بلیغ ہو، لڑکی بولی "تم پر افسوس ہے! کیا

ان شعروں کو بھی فصیح کہا جاسکتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کا قول۔

وَ اَوْحَيْنَا اِلَى اُمِّ مُوسَى اَنْ اَرْجِعِيْهِ بِهٖمْ نَعْمَ مَوْسٰى اٰتٰىہٗم مِّنْ اٰیٰتِنَا لَعَلَّہُمْ یَتَّقُوْنَ

فَاِذَا خِضَّتْ عَلَیْہِ فَاَلْقِیْہِ فِی الْیَمِّ وَوَدَّ اَنْ یَّوَدَّ اَنْ یَّوَدَّ اَنْ یَّوَدَّ اَنْ یَّوَدَّ

وَلَا تَخَافِیْ وَلَا تَحْزَنِیْ اِنَّا رَادُوْہٗ سَمْعَدِیْنِ وَالدَّوَابُّ سِرْبٌ خَوْفٌ کَرِیْمٌ وَرَبُّہٗ غَلِیْمٌ

الْيَتْلُقُ وَجَاءَ عَلُوهُ مِنَ الْمُرْسَلِينَ ہم بے شبہ اس کو تہاری طرف لوٹائیں گے اور پیغمبر نبائیں گے
ان آیات کو پڑھنے کے بعد لڑکی نے کہا "اِصْحٰی" تم دیکھتے نہیں ان میں خدا نے کس طرح دو امر دونہی
اور دو بشارتیں جمع کر دی ہیں۔

بہر حال فہم قرآن کے لئے صرف عربی دانی کافی نہیں۔ بلکہ عربیت کا ذوق صحیح درکار ہے
اور خوب اچھی طرح یاد رکھئے کہ یہ ذوق محض مقامات حریری، دیوان متنبی اور دیوان حماسہ، یا ایم لے
عربی کو رس پڑھ لینے سے حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے لئے ایک مدت دراز درکار ہے۔ ذوق سے مراد
یہ ہے کہ کسی شخص کو عربی کلام پڑھتے وقت وہی لذت و سرور حاصل ہو جو اس کو خود اپنی زبان کا
اچھا شعر سن کر حاصل ہوتا ہے۔ وہ عربی کے تمام محاورات، ان کے مواقع استعمال سے پورا واقف ہو۔
ایک مفہوم کو مختلف طریقہ بے بیان سے ادا کیا جاسکتا ہے، وہ جانتا ہو کہ ایک طریقہ کو دوسرے طریقہ
بیان پر کیا تفوق حاصل ہے۔ فرض کیجئے ایک جملہ تین لفظوں سے مرکب ہے۔ زید، آیا اور آج۔ ہر
صاحب ذوق جانتا ہے کہ ان میں ترتیب بدل دیجئے تو جملہ کا مفہوم ہی بدل جاتا ہے۔ ذوق سے غرض
یہ ہے کہ وہ ان باریک باریک فروق سے بھی واقف ہو۔

بعض اوقات کسی کلام میں کوئی لفظ محذوف ہوتا ہے اور اس بنا پر مختلف معنی مراد لئے
جاسکتے ہیں، لیکن اہل زبان کے نزدیک اس کا صرف ایک ہی مفہوم ہو سکتا ہے اور وہاں وہی
مراد ہوتا ہے۔

حضرت مزار مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور واقعہ ہے۔ آپ نے ایک مرتبہ اپنے ایک
پشاورى مرید سے فرمایا جس کو دہلی میں رہتے ہوئے ایک مدت ہو گئی تھی "میاں ذرا صراحی اٹھا لانا اور
دیکھنا پیٹ پکڑ کر اٹھاتا سمجھدار مرید نے کیا کیا۔ ایک ہاتھ سے صراحی کی گردن پکڑی اور دوسرے ہاتھ
سے اپنا پیٹ پکڑا۔ اور اس شان سے صراحی حضرت شیخ کے سامنے لا کر رکھ دی۔

اس واقعہ سے آپ کو زبان دانی اور ذوق زبان کا فرق تین طور پر معلوم ہو جائیگا۔ یہ پشاورى
مرید عرصہ سے دہلی میں رہنے کے باعث اردو کا زبان داں ضرور ہو گیا تھا لیکن زبان کے ذوق سے

بالکل بے بہرہ تھا۔ ورنہ اسے معلوم ہوتا کہ حضرت مرزا کے جملہ پیٹ پکڑ کر اٹھانا میں اگرچہ یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ پیٹ کس کا ہوگا۔ صراحی کا یا خو اس کا اپنا تاہم اہل زبان کے نزدیک اس کا صرف ایک ہی مفہوم ہو سکتا ہے اور وہ ہے "صریحی کا پیٹ" اور اس کو جاننے کے لئے محض زبان دانی کافی نہیں بلکہ ذوق لسانی درکار ہے۔

اسی طرح کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک لفظ بولا جاتا ہے لیکن کسی خاص موقع پر اس سے مراد اس کے اصل معنی نہیں ہوتے بلکہ اس کے برخلاف اس کی ضد مراد ہوتی ہے۔ مثلاً آپ ایک مریض کے پاس اس کی عیادت کے لئے جاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کیا حال ہے؟ مریض جو اب میں کہتا ہے "اچھا ہوں"

اہل ذوق سے پوشیدہ نہیں کہ اس جملہ کے دو متضاد مفہوم ہو سکتے ہیں فرق صرف لہجہ کا ہے۔ اگر مریض نے بیماری کی درازی اور صحت سے بایوسی کے عالم میں حسرت آمیز لہجہ سے "اچھا ہوں" کہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اچھا نہیں ہوں۔ اس وقت مریض کا یہ اچھا کہنا شعر ذیل کا مصداق ہے

پوچھنے والوں نے میرا نک میں دم کر دیا جس نے پوچھا حالِ دل کہنا پڑا کچھ بھی نہیں
اور اگر بیمار نے انسا ط خاطر کے ساتھ اپنے تئیں اچھا کہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ واقعی وہ اب اچھا ہے۔

بسا اوقات جملہ استفہامیہ بولا جاتا ہے اور اس سے غرض کسی شے کے متعلق کچھ دریافت کرنا بھی ہو سکتا ہے اور استفہام انکاری کے طور پر کسی سے انکار کرنا یا بطور استفہام اقراری کسی بات کا اقرار کرنا بھی مراد ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک شخص جو زبان کے ذوق سے بہرہ وافر رکھتا ہے اس جملہ کو سنتے ہی معلوم کر لیتا ہے کہ یہاں تشکیک کی مراد لیا ہے۔

ہر کلام کا صحیح مفہوم	علماء بلاغت نے اسی بنا پر سچ کہا ہے کہ الفاظ میں تراویف ہے ہی نہیں اور
ایک ہی ہوتا ہے	ایک کلام کا مطلب صرف ایک ہی ہو سکتا ہے، غیر زبان داں طرح

طرح کی تاویل میں اور دروازہ کار توں جہیں کرتا ہے لیکن صحیح مخاطب جب اس کلام کو سنتا ہے تو فوراً ایک ہی مفہوم متعین کر لیتا ہے اور اس کو توجیہات مختلفہ کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے پھرتے کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی۔

بلاغت کے مختلف درج و مراتب | یہاں اس حقیقت کو بھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ بلاغت کے مدارج و مراتب لامحدود ہیں یعنی کسی کلام کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ اس پر بلاغت

ختم ہے، کیونکہ بلاغت کی تعریف ہے کلام کا مقتضی حال کے مطابق ہونا، اور ذرا ذرا سے فرق سے حال اور مقتضی حال کی مطابقت کی اس قدر قسمیں پیدا ہوتی ہیں کہ ان کا کوئی شمار ہی نہیں ہو سکتا اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ فلسفہ اخلاق میں کسی قوت کے اعتدال سے جو ملکہ پیدا ہوتا ہے، فضیلت کہلاتا ہے اور اس کے برخلاف قوت کی افراط یا تفریط سے جو ملکات پیدا ہوتے ہیں، رذائل کہلاتے ہیں لیکن کسی ملکہ کا اچھا یا برا ہونا ایک دوسرے کے اعتبار سے ہی متصور ہو سکتا ہے و حقیقت اس کے اقسام کی تحدید و تعین نہیں کی جاسکتی۔ تھوڑے تھوڑے فرق و امتیاز سے اور قوت اعتدال کی کمی و بیشی کے لحاظ سے جس طرح رذائل بے شمار نکل آتے ہیں فضائل بھی ان کے بالمقابل لا تعداد پیدا ہوتے جاتے ہیں، ٹھیک ہی حال بلاغت کے مدارج و مراتب کا ہے ایک کلام خواہ کتنی ہی بلاغت رکھتا ہو، کسی دوسرے کلام سے کمتر ہو سکتا ہے، ایک طرف بلاغت کے مدارج کا لامحدود ہونا پیش نظر رکھئے اور دوسری طرف علماء بلاغت کا یہ فیصلہ دیکھئے کہ قرآن بلاغت کے اس انتہائی مرتبہ کو حاوی ہے جو کسی کلام کے لئے انتہائی سے انتہائی مرتبہ ہو سکتا ہے۔

اس بیان سے واضح ہو گیا ہو گا کہ عربیت کے ذوق صحیح سے مراد کیا ہے؟ مقصد یہ ہے

کہ ائمہ عرب کے کلام کی مزاولت و ممارست سے ایک ایسا پختہ ذوق پیدا ہو جائے کہ وہ عربی کلام کے درلول و منطوق کو پورے طور پر سمجھ سکے، اس کے اشارات و کنایات سے واقف ہو، الفاظ کا صحیح مفہوم متعین کر سکے اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کو فصیح و بلیغ کلام سن کر حقیقتہً حظ آئے، اور برے کلام سے اس کے ذوق کو صدمہ پہنچے۔

پس یہ ظاہر ہے کہ ایک شخص کا ذوق جس قدر زیادہ لطیف و پاکیزہ ہوگا اسی قدر وہ کلام بلیغ و
مخطوط و شاد کام ہوگا اور اس کو اس میں زیادہ سے زیادہ باریکیاں نظر آئیں گی۔

اس طرح کا ذوقِ عربیت ساہا سال کی عرق ریزی، محنت و کاوش عمیق و وسیع مطالعہ
اور بہترین دماغی و ذہنی صلاحیتوں کے کارآمد بنانے کے بعد ہی حاصل ہو سکتا ہے اور چونکہ قرآن مجید
بلاغت کے مرتبہ قصویٰ پر حاوی ہے، اس لئے کوئی شخص بجز ان بزرگانِ کرام کے جن کو خود
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مشکوٰۃ نبوت سے منور کیا ہو، دعویٰ کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا
کہ کسی آیت کا مطلب وہی ہے جو اس نے سمجھا ہے۔

دنیوی امور میں ماہرین کی | جو لوگ دین کے معاملہ میں اس درجہ متساہل واقع ہوئے ہیں غور کریں
طرف مراجعت کی جاتی ہے | دنیوی معاملات میں خود ان کی تقلید کا کیا عالم ہے۔ آپ کسی شخص کو اس وقت
تک ڈاکٹر تسلیم نہیں کرتے جب تک اس نے باقاعدہ کسی اسکول یا کالج میں ڈاکٹری کا کورس پورا
نہ کیا ہو کسی شخص کے قانونی مشورہ کو اس وقت تک درخور اعتبار نہیں سمجھتے جب تک اس نے باقاعدہ
وکالت یا بیرسٹری کا امتحان پاس نہ کیا ہو۔ پھر ڈگری کی حیثیت کے اعتبار سے ڈگری یافتہ کے اعزاز و
اکرام میں بھی فرق مراتب کو ملحوظ رکھا جاتا ہے، ہندوستان کے ایم بی بی ایس یا ایل ایل بی کے قول کا
وہ وزن نہیں ہوتا جو انگلینڈ کی کسی طبی ڈگری یا بیرسٹری کے ڈپلومے ولے کا ہوتا ہے "نیم حکیم" کے
قول کو آپ ہمیشہ "خطرہ جان" سمجھتے ہیں۔ پھر حیرت ہے کہ دین کے معاملہ میں آپ "نیم مولوی" کے
فتوے کو "خطرہ ایمان" قرار نہیں دیتے۔ ترجمہ کی مدد یا عربی کی معمولی شد بد حاصل کر لینے سے کسی
کو یہ حق ہرگز نہیں پہنچتا کہ وہ مدعیانہ رنگ میں ان لوگوں کے مقابل آئے جنہوں نے اپنی عمر میں
ان ہی علوم اسلامیہ کی خدمت میں بسر کی ہیں اور جنہوں نے اپنی زندگی کی تمام راحتوں اور آسائشوں کو
برباد کر کے قرآنی حقائق و معانی کی چھان بین میں خون جگر پیا ہے۔

یہ ہو سکتا ہے کہ آپ سائل کی حیثیت سے اپنے شکوک و شبہات کو علمائے کرام کے سامنے
پیش کریں اور ان سے جواب کے طالب ہوں، لیکن آپ کے لئے یہ کبھی جائز نہیں ہو سکتا کہ چند

مخصوص خیالات کو ذہن میں رکھ کر عربیت سے بالکل ناواقف ہونے کے باوصف آپ مجتہدانہ انداز میں کلام کرنے کی جسارت کریں، اور جس امام کی بات آپ کے خیال کے مطابق نہ ہو آپ اس پر بے تکلف تبراً شروع کر دیں۔ پس آپ کے لئے دو صورتوں کے سوا کوئی اور تیسری صورت نہیں ہے یا خود عربیت کا ذوق پیدا کیجئے علوم اسلامیہ کی تکمیل کر کے ان میں بصیرت و نظر حاصل کیجئے اور اگر یہ نہیں ہے تو ائمہ اسلام پر اعتماد کیجئے اور ان کی بات مانئے۔ آج ہر وہ شخص جو فہم قرآن کا مدعی ہے اس کو بتانا چاہئے کہ وہ کہاں تک اس دعوے کا اہل ہے۔ قرآن بیشک آسان ہے لیکن کسی شے کے آسان ہونے کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ اس کے سمجھنے کے لئے نہ اس کے مبادی جاننے کی ضرورت ہے اور نہ اس کے لئے کچھ اصولی موضوعہ ہیں جن کو سمجھنا اور جن پر غور کرنا ضروری ہو۔

تفسیر کی تعریف | ابو حیان الاندلسی صاحب بحر المحیط نے تفسیر کی تعریف اس طرح کی ہے۔

هو علم يبحث فيه عن كيفية النطق
بالفاظ القرآن ومدلولاتها واحكامها
الافرادية والتركيبة ومعانيها
التي يحمل عليها حالة التركيب
ان معانيها من جنسها بالتركيب
محمول كمنه في بحثها جاتي هي - اور

ان کے علاوہ چند اور تعریفات بھی ہیں جن کا علم مفسر کیلئے ضروری ہے

علامہ سید مرتضیٰ زبیدی اس قول کو اجاباً العلوم للامام الغزالی کی شرح میں نقل کرنے

کے بعد فرماتے ہیں۔

ابو حیان کے اس قول میں علم جنس ہے اور اس کے بعد جو قیود آئی ہیں وہ بمنزلہ فصل ہیں

چنانچہ 'یبحث' فیہ عن کیفیت النطق بالفاظ القرآن سے مراد علم قرأت ہے۔ و

مدلولاتها سے مراد انھیں الفاظ قرآن کے مدلولات ہیں اس کا مصداق من علم لغت ہے

جس کے بغیر الفاظِ قرآن کے مدلولات کا علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ احکامها الاخرادیة
 والترکیبیتہ" اس کے لئے علمِ تصریف بیان اور بدیع کی ضرورت ہے "معانیہا منہ سے
 مراد یہ ہے کہ مفسر کو معانی پر الفاظ کی دلالتِ حقیقی اور دلالتِ مجازی سے واقفیت ہو۔
 کیونکہ کسی ایسا ہوتا ہے کہ ترکیب اپنے ظاہر کے انقباض سے کسی چیز کا اقتضا کرتی ہے، لیکن
 اس کے لئے کوئی مانع ہوتا ہے تو اب لفظ سے کوئی معنی مجازی مراد لینے پڑتے ہیں۔

پھر آخر میں ابو حیان نے "وتمت ما ہو کہا ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ مفسر کو نسخ اور سبب
 تولد وغیرہ کا علم ہونا چاہئے تاکہ قرآن میں جو باتیں مبہم ہیں وہ معلوم ہو سکیں۔ ۱۷

ابو حیان کا یہ بیان تو قرآن مجید کی تفسیر سے متعلق عام شرائط پر مشتمل ہے۔ اب ہم ذیل میں
 خاص عربیت کی شرط سے متعلق بعض ائمہ عربیت کے اقوال نقل کرتے ہیں۔ چنانچہ
 دعواتوں کی رائے | امام ابو بکر الباقلائی فرماتے ہیں۔

من زعم انہ یکنہ ان یفہم جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ وہ خود بلاغت
 شیخ من بلاغۃ القرآن بدون کی مشق و مہارت کے بغیر قرآن مجید کی
 ان ہا رس البلاغۃ بنفسہ فہو بلاغت کو تھوڑا بہت سمجھ سکتا ہے وہ جھوٹا
 کاذب مبطل ہے۔ اور باطل گو ہے۔

امام موصوف نے تو صرف بلاغتِ قرآن تک ہی بات محدود رکھی ہے، علاوہ شیدر ضا
 نے "تفسیر المنار" میں لکھا ہے کہ عربیت کے بغیر کوئی شخص قرآن مجید سے نصیحت پذیر بھی نہیں ہو سکتا
 کہتے ہیں۔

لا یستعظ الا انسان بالقرآن کوئی شخص قرآن مجید سے نصیحت پذیر نہیں ہو سکتا
 فتطمئن نفسہ بوعدہ و یا باین معنی کہ کچھ اس کا نفس قرآنی وعدوں پر مطمئن ہو جائے
 فتخشع لوعدہ الا اذا عرف اور وعدے لرز جائے جب تک کہ اس کے معانی کو

معانیہ و ذاق حلاوة

سمجھنے کی اہلیت پیدا نہیں کر لیتا اور اس کے طریقہ کے

اسالیبہ بیان کی شیرینی محسوس کرنے نہیں لگتا۔

بہت ہی بیان کرتے ہیں امام مالکؒ فرماتے تھے کہ اگر میرے پاس کوئی ایسا شخص لایا جائے جو عربی زبان سے واقف نہ ہو اور اس کے باوجود کلام اللہ کی تفسیر کرتا ہو تو میں اس شخص کو سزا دوں گا۔ لے مجاہد کا مقولہ ہے جو شخص اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ اللہ کی کتاب کے متعلق کلام کرے۔ اگر وہ لغات عرب کو نہیں جانتا

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا "جو شخص عربیت سے ناواقف ہے وہ بسا اوقات ایک آیت پڑھتا ہے اور اس طرح کسی لفظ کو پڑھتا ہے کہ وہ اس کے لئے باعثِ ہلاکت بن جاتا ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ قرآن مجید نے اپنی نسبت آسان ہونے کا دعویٰ کیا ہے لیکن اس کے باوجود اس نے خود علم کے اعتبار سے لوگوں میں تفریق کی ہے۔ ارشاد ہے۔

لَعَلِمَ الَّذِينَ يَسْتَبِطُونَ اس کو وہی لوگ جانتے ہیں جو احکام کا استنباط

منہم کر سکتے ہیں۔

دیکھے جہاں تک نصیحت حاصل کرنے کا تعلق ہے صاف طور پر فرمایا جاتا ہے "وَلَقَدْ كَيَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ" کسی عالم وغیر عالم کی تخصیص نہیں کی جاتی۔ لیکن جب اس کے علم کا ذکر کیا جاتا ہے تو اسے ان لوگوں کے ساتھ مخصوص کر دیا جاتا ہے جو مفہوم کلام پر پورے طور سے حاوی ہو کر احکام کا استنباط کر سکیں۔ اور ظاہر ہے یہ سلیقہ ذوق عربیت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔

کسی زبان کے ادب و بلاغت کا ذوق ایک نعمتِ خدا داد ہے، تاہم اس کے استوار ہونے میں اس زبان کے علوم صرف و نحو، معانی و بلاغت سے بڑی مدد ملتی ہے۔ جب تک اسلام عرب میں محدود رہا اس وقت تک علوم عربیہ میں سے نہ کوئی علم و فن بدوون ہوا تھا اور نہ کسی علم کی ضرورت تھی۔ قواعد زبان سے بنتے ہیں نہ کہ زبان قواعد سے۔ یہی وجہ ہے کہ عہد صحابہ میں قرآن مجید کی

تفسیر کے متعلق اختلاف بہت کم نظر آتا ہے لیکن جب قرآن کی اشاعت عربی زبان نہ جاننے والے ملکوں میں ہوئی اور وہ لوگ کثرت سے اسلام میں داخل ہونے شروع ہوئے تو اب ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کو قرآن فہمی کے قابل بنانے کے لئے عربیت کے علوم و فنون کو مدون کیا جائے۔ چنانچہ صرف و نحو اور دوسرے علوم کی تدوین عمل میں آئی۔

غور کرنا چاہئے جب تک معاملہ اہل زبان تک محدود رہا۔ کسی علم و فن کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ لیکن جب ان سے گذر کر عجمی اقوام تک اس کی رسائی ہوئی تو محض قرآن مجید کو صحیح پڑھنے اور اس کو سمجھ سکنے کے لئے ان تمام علوم و فنون عربیہ کی داغ بیل پڑی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جب تک کوئی شخص عربیت کے تمام علوم جن کی تعداد علما نے چودہ لکھی ہے بدرجہ کامل حاصل نہیں کرے گا۔ اسے حق نہیں ہے کہ قرآن کی کسی آیت کے متعلق اپنی ذاتی رائے پیش کر سکے اس کے لئے بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ خود مریض ہے تو اطباء پر اعتماد کرے اور ان کے تجویز کے ہوتے نسخہ کو اپنے لئے پیغام شفا سمجھے۔

یہاں یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ اس کے لئے صرف عربی زبان و ادب پر عبور حاصل کر لینا ہی کافی نہیں بلکہ اس سلسلہ میں الفاظ مفردہ جو قرآن مجید میں آئے ہیں ان کے حقائق و پورے طور پر باخبر رہنا ضروری ہے یعنی ان الفاظ کے لغوی معانی سے گذر کر معلوم کرنا چاہئے کہ نزول قرآن کے زمانہ میں یہ الفاظ کن معانی میں استعمال ہوتے تھے۔ مثلاً تاویل کا لفظ ہے کہ نزول قرآن کے بہت بعد تفسیر کے معنی میں بولا جانے لگا لیکن خود قرآن میں یہ لفظ اس معنی میں نہیں آیا ہے۔ مثلاً آیت ذیل میں۔

هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا تَأْوِيلَهُ يَوْمَ يَأْتِي تَأْوِيلَهُ يَقُولُ الَّذِينَ نَسُوا
 مِنْ قَبْلُ قَدْ جَاءَتْ رُسُلٌ
 رَيْنَا بِالْحَقِّ - (الاعراف) پہلے سے ببول گئے تھے کہیں گے بے شبہ ہمارے پاس ہمارے

امام غزالی نے اجیاء العلوم میں اس شخص کو بھی تفسیر بالرائے کی وعید کا مستحق بتایا ہے جو علوم عربیت سے نا آشنا ہونے کے باوجود تفسیر کی جرأت کرتا ہے۔ چنانچہ تفسیر بالرائے کا مطلب اور اس کا مصداق و مفہوم بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

الثانی ان یتسارع الی تفسیر القرآن تفسیر بالرائے کا دوسرا مصداق یہ ہے کہ کوئی بظاہر العربیۃ من غیر استظہار شخص لفظوں کی محض ظاہری شکل و صورت کو بالسمع والنقل فیما یتعلق بغرائب دیکھ کر تفسیر قرآن کی جرأت کرے اور قرآن مجید القرآن ووافیہ من الالفاظ المبہمة میں جو غرائب ہیں اور ان کے علاوہ جو اور الفاظ والمہذلت ووافیہ من الاختصار مبہم، مہملہ یا اور جو اختصار ہے ان کے حل کرنے میں سماع اور نقل سے مدد نہ لے۔

کتنے ہی لفظ ہیں جن کے معنی نزول قرآن کے وقت کچھ اور تھے اور دو ایک صدیوں کے بعد وہ کسی اور معنی میں مستعمل ہونے لگے۔ پس جو شخص فہم قرآن کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن مجید کے کسی لفظ سے وہی معنی مراد لے جو عہد نبوت میں اس سے مراد لئے جاتے تھے۔

اصوات و لہجات | عربیت اور اس سے متعلقہ علوم و فنون کے ساتھ فہم قرآن کے لئے یہ بھی عرب کا علم | ضروری ہے کہ ان تمام لہجوں اور آوازوں سے واقفیت پیدا کی جائے جو نزول قرآن کے وقت عرب میں مستعمل تھے اور پھر اس کا سراغ لگایا جائے کہ قرآن ان میں سے کس کس لہجہ اور آواز پر نازل ہوا ہے ورنہ اس علم کے بغیر فہم قرآن کی کوشش گمراہی کا سبب بن سکتی ہے مثلاً سورہ نمل میں حضرت سلیمان کے قصہ میں ہے "اولا اذ بھجتہ" جو شخص قرآن عرب کی قرار توں اور ان کی خصوصیتوں سے واقف نہیں ہے وہ اس فقرہ کا ترجمہ نفی کے ساتھ کریگا یعنی یہ کہ میں اس کو (بہید) فہم نہیں کروں گا، لیکن اس کے برخلاف لہجات عرب سے باخبر شخص فوراً سمجھ لیگا کہ دراصل یہ "لا" لے نافیہ نہیں ہے بلکہ لام کے فتح کو ذرا کھینچ دینے کی وجہ سے صورت "لا" کی ہو گئی ہے

اور اسی لہجہ کے مطابق اس لفظ کی قرآن میں کتابت بھی ہوئی ہے۔

لہجہ کا اختلاف تو ایک ایسی چیز ہے کہ خود صحابہ کرام کو بعض مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارہ میں استفسار کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ صفوان بن عسال سے روایت ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یا یحییٰ پڑھتے ہوئے سنا تو عرض کیا یا رسول اللہ! آپ امانہ کر رہے ہیں حالانکہ یہ تو قریش کا لغت نہیں ہے، آپ نے فرمایا لیکن ان کے ماموں بنو سعد کا لغت ہے دوسری شرط | ان علوم رسمیہ میں کمال حاصل کرنے کے ساتھ دوسری چیز جو قرآن کے مطالب کو بصیرت کے ساتھ سمجھنے کے لئے از بس ضروری ہے، وہ نور بصیرت ہے، یا دوسرے لفظوں میں اسے 'ذوقِ قرآنی' کہہ سکتے ہیں۔ ایک قرآن پڑھی کیا موقوف ہے، دنیا کا کوئی علم و فن ایسا نہیں ہے جس میں کمال اور مجتہدانہ نظر پیدا کرنے کے لئے عام فطانت و ذکاوت کے علاوہ اس علم کے ساتھ ایک فطری لگاؤ ضروری نہ ہو۔ علی گڑھ سے ہزاروں نے بی اے اور ایم اے کا امتحان پاس کیا، لیکن محمد علی مرحوم کی طرح انگریزی کے بہترین ادیب کتنے پیدا ہوئے۔ دیوبند سے ہزاروں علماء کو سندِ فراغت تقسیم کی۔ لیکن ان میں ایسے کتنے ہیں جو حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ کی سی نظر بصیرت رکھتے ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ جب کسی انسان کو کسی خاص فن کے ساتھ دلچسپی ہوتی ہے تو اس کی نظر اس فن کے مسائل کے لئے ایک بیگانہ کی نہیں بلکہ آشنائے دیرینہ کی نظر ہوتی ہے، زندگی کے ہر شعبہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ کسی کام میں کامیابی کا مدار ایک بڑی حد تک اس سے دلچسپی اور فطری لگاؤ پر ہوتا ہے۔ ڈاکٹری کا اعلیٰ سے اعلیٰ امتحان پاس کرنے والے کیا سب ایک سے ہی ہوتے ہیں۔ پھر بیسٹری کی ڈگری رکھنے والے کیا مذاقتِ فن اور کمال پیشہ اور مہارتِ قانون کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہوتے؟

یہ چیز مزید بحث و نظر کی محتاج نہیں ہے۔ ہر شخص بدابہتہ اس کو جانتا ہے مگر کیا کیجئے

اس زمانہ میں جس طرح بعض پرانی نظری باتیں بدیہی بن گئی ہیں۔ اس کے برخلاف بعض بالکل بدیہی اور مسلم حقیقتیں بھی نظر و فکر کے حجاب میں پوشیدہ ہوتی جا رہی ہیں۔

کسی فن کے ساتھ یہ فطری لگاؤ اور اس کا ذوق صحیح بالکل خدا داد بات ہے۔ یہ نعمت ہر ایک شخص کے حصہ میں نہیں آسکتی۔ اس بنا پر اگر ہم اس فن کے کسی ماہر خصوصی کی طرف نسبت کر کے یوں کہہ دیں کہ ہر شخص اس جیسا نہیں ہو سکتا تو کوئی شبہ نہیں کہ ہمارا یہ کہنا بالکل درست اور بجا ہوگا۔ اسی طرح ہم اگر یوں کہیں کہ قرآن مجید کو ہر شخص حضرت ابن عباسؓ یا حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کی طرح نہیں سمجھ سکتا تو اہل انصاف جانتے ہیں ہمارا یہ کہنا سراسر حق ہے۔ کوئی شخص اس کی تکذیب نہیں کر سکتا، اب اس حقیقت کو پیش نظر رکھئے اور دیکھئے ایک بر خود غلط گریجویٹ کس قدر مضحکہ انگیز بات کہتا ہے۔

قرآن سب سے زیادہ آسان کتاب ہے۔ نہ یہ مابعد الطبیعة کا فلسفہ ہے، نہ ریاضی کی کتاب کہ اس کے لئے تحقیق کی جائے، انسان جس کو خدا نے دو آنکھیں اور دو کان اور ایک صیغہ دماغ دیا ہے، وہ قرآن کے سمجھنے کا اتنا ہی اہل ہے جتنا کہ ایک علامۃ اللہوغی، قرآن کے سارے احکام پر ہمارا عمل ہونا چاہئے، نہ اس میں کسی تاویل کی ضرورت اور نہ کسی تفسیر کی۔

اس تقریر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فہم قرآن کے لئے اولین طور پر دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک علوم عربیہ کی بہارت اور دوسرا ذوق قرآنی۔ پہلی چیز کسی ہے اور دوسری وہی جس طرح کوئی شخص شعر و ادب کے فطری ذوق کے بغیر شاعر و ادیب نہیں ہو سکتا۔ ٹھیک اسی طرح "ذوق قرآنی" کے بغیر فہم قرآن کا اہل بھی نہیں ہو سکتا۔

این سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خداے بخشندہ

علامہ سید رشید رضا نے اسی حقیقت کو اس طریقہ پر بیان کیا ہے:-

"وہ حق جس کے اندر کوئی شک و شبہ نہیں ہو سکتا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

وہ تمام قرآن لوگوں تک پہنچا دیا جو آپ پر نازل ہوا تھا۔ اور اس کو آپ نے وضاحت کے ساتھ بیان بھی کر دیا۔ آپ نے علم دین کی کسی شے کے ساتھ کسی کو مخصوص نہیں کیا ہے اور نہ علم دین میں کسی کو کسی پر فوقیت ہو سکتی ہے البتہ صرف فہم قرآن کی وجہ سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دی جا سکتی ہے اور یہ فہم قرآن دو چیزوں سے حاصل ہوتا ہے ایک ان میں کسی ہے دوسری وہی۔ کسی علوم یہ ہیں مثلاً علم السنن، آثار علماء، صحابہ، تابعین، اور صدر اول میں جو علماء اصحاب تھے ان کے اقوال اور مفردات لغت اور اس کے اصالیب و طرق اور اسی طرح دوسرے علوم و فنون میں مثلاً علم فطرت تاریخ عالم، نغیبات انسان۔ ان سب علوم سے قرآن کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اور یہ سب علوم مکتبہ میں جو کوشش اور جدوجہد سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

اور دوسری قسم وہی ہے اور یہ وہی ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا ہے کہ فہم قرآن ایک خاص نعمت ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ اپنے خاص خاص بندوں کو ہی نوازتا ہے۔ اور اس قسم ثانی کی وجہ سے ہی علوم کبیرہ میں مہارت رکھنے والے علماء ایک دوسرے پر باہمی فضیلت و برتری رکھتے ہیں۔ مگر جو شخص علم عربیت سے نا آشنا اور سنن و آثار سے ناواقف ہے اس کو علم وہی سے بھی کوئی حصہ نہیں ملتا ہے۔ کیونکہ علم کسی تو اصل ہے جو علم وہی کو بطور نتیجہ پیدا کرتا ہے۔

تیسری شرط اتقار | دنیا کے مختلف علوم و فنون اور مختلف زبانوں میں مہارت اور بصیرت پیدا کرنے کے لئے خاص خاص شرائط ہوتی ہیں، اگر وہ طالب میں پائی جائیں گی تو اس کو اس علم خاص میں مہارت پیدا ہو سکے گی ورنہ نہیں۔ شیخ بوعلی سینا نے اپنی مشہور کتاب "اشارات" کے آخر میں بڑے زور سے اپنے شاگرد کو نصیحت کی ہے کہ "میری یہ کتاب ہر شخص کو نہ پڑھائی جائے بلکہ ان ہی لوگوں تک اس کو محدود رکھا جائے جو اہل جہل و فسق نہیں ہیں اور اگر اس کے خلاف

کیا گیا تو میں خدا کے ہاں تمہارا دامن پکڑوں گا۔ پس اسی طرح قرآن مجید کے مطالب کو واقعی طور پر سمجھنے کے لئے علوم و فنون کی دستگاہ اور زبانِ عربی کے لطیف ذوق کے علاوہ تیسری اہم چیز "تقار" ہے۔

تقار سے مراد یہ ہے کہ وہ شخص روحانی اعتبار سے اس بات کی صلاحیت رکھتا ہو کہ کلامِ الہی کو سن کر اس کا اثر قبول کر سکے۔ یہ ظاہر ہے کہ کوئی دو اکتی ہی مفرح اور مقوی ہو لیکن اگر جسم تندرست نہیں ہے اور معدہ و جگر کے فاسد ہونے کی وجہ سے قوتِ ہاضمہ بے کار اور تولیدِ دم کی صلاحیت مفقود ہو گئی ہے تو وہ دوا اپنا اثر نہیں کر سکتی۔ بلکہ بسا اوقات مضر نتائج کے پیدا ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ اسی پر عالمِ روحانی و نفسانی اور اس کے امراض و طرقِ علاج کو قیاس کر لینا چاہئے۔

قرآن مجید نے اپنے "تس" "ہدی" "بشرای" "تذکرہ" اور "نوس" کہا ہے مگر ساتھ ہی ان اوصاف کو مطلق نہیں رکھا۔ بلکہ متعدد مواقع پر فرمایا گیا ہے کہ یہ ان ہی لوگوں کے لئے ہدایت ہے جو ہدایت کے طلبگار ہوں جو مومن و مسلم ہوں اور جو طہارت و پاکیزگی کی زندگی بسر کرتے ہوں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ ه

هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ

بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَ

يَمَارِقُونَ مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ وَالَّذِينَ

يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا

أُنزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ

هُمْ يُوقِنُونَ۔ (البقر)

آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

دوسرے مقام پر فرمایا گیا۔

وَلَقَدْ جِئْتَهُمْ بِكِتَابٍ فَصَّلْنَاهُ
عَلَىٰ عِلْمٍ هُدًى وَرَحْمَةً
لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ (الاعراف)

ہدایت اور رحمت بنا کر مفصل بیان کیا ہے۔
ایک مقام پر ہدی و بشری للمسلمین اور دوسری جگہ شفاء و رحمة للمؤمنین
اور ایک جگہ ان فی ذلک لرحمة و ذکر لِقَوْمٍ یُؤْمِنُونَ اور ایک مقام پر ہول للذین آمنوا
ہدی و شفاء فرمایا گیا ہے۔

ان صلحاء، اتقیار اور مؤمنین قانتین کے برعکس وہ لوگ ہیں جو فسق و فجور میں مبتلا
رہ کر اعمال بد کرتے ہیں اور دن رات سرکشی میں مصروف رہتے ہیں ان کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ
قرآن سے ان کے دلوں میں نور علم و ہدایت پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس سے ان کی گمراہیاں اور
بڑھتی ہیں۔ ارشاد ہے۔

وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا خَسَارًا
وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُمْ قَدْ انزَلَ
إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا

اور قرآن مجید ظالموں کے لئے نقصان کو ہی بڑھاتا ہے
اور اسے نبی جو آپ پر اترا ہے وہ ان لوگوں میں سے
بہتوں کی سرکشی اور کفر کو زیادہ کرنے والا ہے۔
ایک آیت میں ایمانداروں اور بے ایمانوں میں فہم قرآن اور اس کے اثرات کے اعتبار سے
جو فرق ہے بالکل صراحت کے ساتھ کجائی طور پر بیان کر دیا گیا ہے فرماتے ہیں۔

قُلْ هُوَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّ
شِفَاۗءٌ وَّالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ
فِيْ اٰذَانِهِمْ وُقُوْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ
عَمًى اُوْٰلٰٓئِكَ يَنۢبِءُوْنَ مِنْ
تَحْتِ اَرْضٍ رَّجِيْمًا

ہدایت اور شفاء ہے اور وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے
ان کے کانوں میں گرانی ہے۔ اور وہ ان پر اندھا
ہے۔ یہی لوگ ہیں جو دور کے فاصلے سے پکارے
تعمان بعیید۔ (مسموحہ) جاتے ہیں۔
ایک آیت میں صاف طور پر فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ بد عمل ہیں اور تکبر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ

ان کو آیات قرآنی کے فہم سے محروم کر دیگا۔ ارشاد ہے۔

سَأَصْرِفُ عَنْ آيَاتِ الَّذِينَ

جو لوگ زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں میں ان کو اپنی

بے گزریوں فی الارض بغیر الحجة

آیات سے روگرداں کر دوں گا۔

قرآن سے دو مختلف الطبائع اشخاص پر دو متضاد اثر ہوتے ہیں۔

اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا

اللہ نے سب سے اچھی بات اتاری ہے یعنی

مُتَشَابِهًا مَّثَانِي تَفْصِيحًا مِنْهُ

یکساں کتاب دہرائی جانے والی۔ اس سے

جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ

ان لوگوں کے رونگھے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے

ثُمَّ تَلِينَ جُلُودَهُمْ وَقُلُوبُهُمْ

پروردگار سے ڈرتے ہیں، پھر اللہ کے ذکر کیلئے

إِلَى ذِكْرِ اللَّهِ ذَلِكَ هُدًى

ان کی کھالیں نرم ہو جاتی ہیں اور ان کے دل

اللَّهُ يَهْدِي بِمَنْ يَشَاءُ

بھی۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے جسے چاہتا ہے ہدایت

وَمَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ

دیتا ہے اور جسے اللہ گم کرے اسے کوئی ہدایت

هَادٍ - (الزمر) دینے والا نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کفار و شرار کو قرآن مجید سے اعراض کرتے ہوئے دیکھتے تھے تو

طبعی طور پر رنج ہوتا تھا۔ کیونکہ آپ رحمۃ للعالمین تھے، قرآن سرچشمہ سعادت و فیض تھا آپ چاہتے

تھے دنیا کا کوئی فرد اس سے سیراب ہوئے بغیر نہ رہے۔ لیکن یہ ہو کس طرح سکتا تھا، مریض میں دوا

کے اثر کو قبول کرنے کی صلاحیت ہی نہ رہی ہو تو طبیب حاذق کیا کرے۔ مرزا غالب نے کیا خوب کہا ہے

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہل بزم ہو غم ہی جاں گداز تو غم خوار کیا کرے

اللہ تعالیٰ نے آنحضرت کو خطاب کر کے فرمایا:-

مَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقَىٰ

ہم نے آپ پر قرآن اس لئے نازل نہیں کیا

إِلَّا تَذَكَّرَ لِمَنْ يَخْشَىٰ

کہ آپ مشقت اٹھائیں، مگر یہاں یہ نصیحت ان

(سورہ ظہ) لوگوں کیلئے ہے جو ڈرتے ہیں۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث ہے جو عموماً خطبوں میں پڑھی جاتی ہے اس میں ارشاد ہے:-

القرآن حجة لك او عليك قرآن تیرے حق میں دلیل بن کر مفید ہے یا تجھ پر حجت ہے

اس سے مراد یہ ہے کہ اگر قرآن مجید پر عمل کیا جائے، اس کی تعلیم و ارشاد کے مطابق اتقار و طہارت کی زندگی بسر کی جائے تو وہ یقیناً ہدایت کا بہترین سرچشمہ ہے، اور اگر ایسا نہیں ہے تو دوسرے لوگ قرآن مجید کی حقیقی مراد کے خلاف اس سے استنباط احکام کریں گے اور گمراہ ہوں گے، وہ الفاظ کے حقیقی مفہوم کو توڑ موڑ کر ان کو ایسے معانی پہنائیں گے جو ہرگز قرآن کی مراد نہیں ہوں گے اس کے برخلاف وہ لوگ ہیں جو دلوں میں خوفِ خدا رکھتے ہیں۔ روحانیات اور عالمِ مابعد الموت کے منکر نہیں، زندگی کا مقصد دنیوی شہوات و لذات میں مبتلا رہنا ہی نہیں جانتے، بلکہ اخلاقِ جمیلہ اور فضائلِ حمیدہ کی روشنی اپنے اندر پیدا کر کے روحانی کمالات حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس طلبِ صادق، اور اعمالِ صالحہ کے صدقہ میں اللہ تعالیٰ ان کے دل میں ایسا نور پیدا کر دے گا جس سے عالمِ غیب کی حقیقتیں خود بخود برافگندہ نقاب ہو جائیں گی اور مادی کثافتوں کے باعث جن غیر مرنی چیزوں پر ایمان لانا ہمارے لئے دشوار ہوتا ہے، وہ خود بخود ان کے آئینہ قلب میں اس طرح جلوہ ریز ہوں گی کہ ان سے انکار نہیں کیا جاسکے گا اور اس وقت صحیح معنی میں ان کا اعتقاد بالجنات ایمان کی صورت اختیار کر لے گا۔

اتقار کی ایک فلسفہ یونان کے طلباء جانتے ہیں، علم کی تعریف میں کتنا زبردست اختلاف عقلی توجیہ ہے۔ کوئی اس کو حصولِ صورت کہتا ہے، کسی کے نزدیک حاضر عند المدرک کا

نام علم ہے، اور کوئی قوتِ مدکہ کو ہی علم بتاتا ہے اور کسی کے خیال میں علم ایک معنی اضافی ہے جو عالم اور معلوم کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ حکماء اشراقیین فرماتے ہیں "علم ایک نور ہے، جو اللہ تعالیٰ کسی کے دل میں پیدا کر دیتا ہے اور وہ معلومات کے ادراک کا منشاء بنتا ہے۔ ہماری رائے میں یہی قول درست ہے اور اسلامی نقطہ نظر بھی اس کی ہی تائید کرتا ہے۔ چنانچہ امام شافعیؒ کے دو شعر مشہور ہیں۔

شکوت الی وکیع سوء حفظی فاوصانی الی ترک المعاصی

میں نے اپنے استاد وکیع سے اپنے برحفاظہ ہونے کی شکایت کی تو انہوں نے گناہوں کے ترک کر دینے کی ہدایت فرمائی

لأن العلم نورٌ من إلهٍ ونور الله لا يعطى للعاص

اور کہا کہ علم خدا کا ایک نور ہے ، جو کسی گناہگار کو نہیں دیا جاسکتا

فلسفہ کے نقطہ نظر سے غور کیجئے تب بھی یہی درست معلوم ہوتا ہے ، فلاسفہ نے ادراک

کے جو مدارج بتائے ہیں ان میں سب سے اعلیٰ درجہ عقل بالفعل ، یا عقل مستفاد ہے۔ اس مرتبہ پر

پہنچ کر انسان کو عقل فعال کے ساتھ جو صور معقولہ کا خزانہ ہے ، غایت قرب و اتصال حاصل

ہو جاتا ہے اور اس اتصال کی بنا پر عقل فعال کی جانب سے جن صور معقولہ کا فیضان ہوتا ہے انسانی

ذہن و دماغ ان کو آسانی کے ساتھ قبول کرنے کی صلاحیت و استعداد پیدا کر لیتا ہے۔ شیخ بوعلی

بن سینا نے اس نفس کو آئینہ کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور بتایا ہے کہ جس طرح آئینہ اپنے مقابل

کی صورت کو قبول کر لیتا ہے اور جب تک وہ اس چیز کے مقابل رہے گا اس کی صورت برابر

اس میں عکس فلک رہے گی ، یہاں تک کہ اگر آئینہ منحرف ہو جائے تو اس انحراف کے مطابق اس

چیز کی صورت کے انعکاس میں بھی فرق پیدا ہو جائے گا۔ ٹھیک یہی حال نفس انسانی کا ہے وہ

جس قدر مادیت سے بعید اور روحانیت سے قریب ہوگا۔ اسی قدر اس میں عقل فعال کے ساتھ

اتصال کی وجہ سے عالم غیب کے حقائق کو قبول کرنے کی صلاحیت زیادہ ہوگی اور اس کے برخلاف

نفس کو مادیت میں جتنا زیادہ انہماک ہوگا اسی قدر اس کو عقل فعال سے بُعد زیادہ ہوتا جائے گا۔ اور

غیب کی باتیں اس کیلئے ناقابل فہم ہوتی جائیں گی۔

پس قرآن مجید کی تصریحات کے مطابق نفس انسانی میں یہ جلا اور نورانیت اعمال صالحہ

اور اتقار و طہارت سے پیدا ہوتی ہے ، اور اس کے بعد اس میں یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ

وہ قرآن مجید کی روحانی تعلیمات کی حقیقی غرض و غایت کو سمجھ سکے اور اس کے مطالب کو کما بینہ

جان سکے اور اگر یہ نہیں ہے بلکہ اعمال فاسدہ کے حجابات اس کے آئینہ دماغ و قلب پر پڑے

ہوئے ہیں تو اس شخص سے صحیح فہم قرآن کی توقع عبث ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن مجید نے اس طرح بیان فرمایا ہے۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا
وَلَهُمْ آعِينٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا
وَلَهُمْ آذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا
أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلَّغْنَا لَهُمُ الْكَلِمَ
أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ۔

ان کے پاس دل تو ہیں مگر ان سے سمجھتے نہیں،
اور ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں،
اور ان کے پاس کان ہیں مگر سنتے نہیں،
یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی
زیادہ گمراہ یہی لوگ غافل ہیں۔

چوتھی شرط | فہم قرآن کے لئے چوتھی شرط یہ ہے کہ ایک آیت میں ایک لفظ کو دیکھ کر ہی اس کی تفسیر و تاویل کی جرأت نہ کی جائے بلکہ تمام قرآن مجید کا مطالعہ بنظر عمیق کر کے قرآن کی زبان اور اس کے طرز اور طریقہ بیان کے ساتھ ایک ایسی مناسبت پیدا کر لی جائے کہ تعین مراد میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ اور ایک جگہ جو کسی لفظ کے معنی مراد لئے گئے ہوں وہ کسی دوسرے مقام کے منافی نہ ہوں۔

اس کی تفصیل یوں سمجھئے، ہر متکلم کے مخصوص طرق بیان ہوتے ہیں اور جب تک کوئی شخص متکلم کی اس خصوصیت سے واقف نہیں ہوگا وہ اس کے کلام کی مراد واقعی طور پر نہیں سمجھ سکے گا۔ مثلاً قرآن مجید میں طہارت کے باب میں ہے۔

وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا
وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ
أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِّنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ
أَوْ لَمَسْتُمُ النِّسَاءَ (الایۃ)

اور اگر تم ناپاک ہو تو خوب پاک ہو جاؤ اور اگر تم
بیمار ہو یا سافر ہو یا تم میں سے کوئی قصار حاجت
سے فارغ ہو کر آیا ہو، یا تم نے عورتوں سے
مقاربت کی ہو۔

”لمستم النساء“ کی مراد میں علماء مختلف ہیں، ایک طبقہ کہتا ہے کہ ”لامسة“ سے مراد محض بدن کا چھونا ہے اور مباشرت نہیں اور اس کی دلیل یوں بیان کرتے ہیں کہ لمس کے معنی حقیقی

چھوڑا ہے اور جب تک معنی حقیقی کا مراد لینا دشوار نہ ہو، معنی مجازی کی طرف رجوع کرنا درست نہیں ہے۔ علماء کا دوسرا گروہ ہے جو اس کو صحیح تسلیم نہیں کرتا اور بلا متہ کے معنی یہاں مباشرت مراد لیتا ہے۔ ہمارے خیال میں اس موقع پر اس بحث میں پڑنا کہ لیس کے معنی حقیقی کیا ہیں اور معنی مجازی کیا؟ اور پھر معنی مجازی اس وقت تک مراد نہیں لئے جاسکتے جب تک کہ معنی حقیقی کے مراد لینے میں تعذر ہو چننا مفید مطلب نہیں بلکہ ضرورت یہ دیکھنے کی ہے کہ لیس اور اس کے ہم معنی لفظ مس لغت کے اعتبار سے کس معنی میں مستعمل ہوتے ہیں، یہ معلوم کرنے کے بعد یہ دیکھنا چاہئے کہ یہ دونوں لفظ قرآن مجید میں کتنے مقام پر آئے ہیں اور وہاں ان سے کیا مراد لی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں تحقیق و تلاش سے کام لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ زن و شوئی کے تعلقات بیان کرنے میں قرآن مجید کا ایک خاص اسلوب ہے کہ وہ ان مواقع پر تصریح سے کام نہیں لیتا بلکہ کنایہ ان چیزوں کو بیان کرتا ہے۔ مثلاً ایام حیض میں مجامعت سے منع کرنا منظور تھا تو فرمایا گیا۔

فَاعْتَرِزُوا النِّسَاءَ فِي الْحَيْضِ (البقرہ) عورتوں سے بحالت حیض الگ رہو۔

طلاق کے احکام میں ہے

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَقْتُمْ

النِّسَاءَ مَا لَمْ مَسُوهُنَّ (البقرہ) دو، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

یہاں لفظ مس ارشاد فرمایا گیا ہے مگر مراد مباشرت ہے اسی سلسلہ میں دوسرے مقام پر ہے

وَإِنْ طَلَقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ

تَمْسُوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ

فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ

إِلَّا أَنْ يَتَحَفَّوْنَ (البقرہ) جبکہ یہ عورتیں معاف کر دیں۔

اس جگہ بھی مس فرمایا گیا ہے مگر مراد مجامعت ہے۔

پھر عدت کے بیان میں ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَكَحْتُمُ
الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَقْتُمُوهُنَّ مِنْ
قَبْلِ أَنْ تَمْسُوهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ
مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُونَهَا (الاضراب)

اے مومن! تم مومنہ عورتوں سے نکاح
کرنے کے بعد اگر ان کو چھوٹنے سے
قبل طلاق دیدو تو ان کے ذمہ تمہارے
لئے عدت نہیں ہے۔

یہ آیت اس باب میں تصریح ہے کہ مس سے مراد مباشرت ہی ہے کیونکہ عدت استبراءِ رحم کے لئے ہوتی ہے اس کے نہ ہونے کا حکم اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ فقدانِ مباشرت کے باعث استبراء کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔

ایک جگہ اسی تعلق کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

وَقَدْ أَفْضَى بَعْضُكُمْ إِلَى بَعْضٍ
جَبَدَ فِي سَوَائِكُمْ فِي رُءُوسِهِمْ دُونَ
الْحَدِّ وَالْحَدِّ وَالْحَدِّ وَالْحَدِّ

ان آیتوں کے مطالعہ اور ان میں جو مضمون بیان کیا گیا ہے، اس کے طرزِ ادا کے معلوم

کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ "لمسکم النساء" میں بھی لمس سے مراد محض چھونا نہیں ہے۔

ایک شبہ اور یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ ان آیاتِ مذکورہ میں تو مس کا لفظ متعدد بار آیا ہے

اس کا جواب اس لئے یہ لمس کے معنی کے لئے کس طرح حجت بن سکتا ہے، جواب یہ ہے کہ

لغت میں مس کے معنی چھونا ہیں اور لمس کے معنی ٹوٹنا ہیں یعنی لمس کے مفہوم میں بہ نسبت مس

کے مخالفت میں شدت پائی جاتی ہے پس جب مس سے مراد مباشرت ہے تو لمس سے مراد

مباشرت بطریقِ اولیٰ ہو سکتی ہے۔

اس طرح اگر قرآن مجید کے کسی لفظ کی مراد کو متعین کرنے کے لئے خود قرآن مجید سے مدد

لی جائے تو غالباً وہ اختلاف و تشتبہ نہ پیدا ہو جو عموماً تفسیروں میں نظر آتا ہے۔ اور نہ وہ گمراہی پیدا ہو

جو قرآن مجید کے طرزِ خطاب و طریقہ بیان سے واقفیت و مناسبت ہم پہنچائے بغیر کسی آیت کی تفسیر

سے پیدا ہوتی ہے اور غالباً اسی بنا پر فرمایا گیا۔

القرآن یفسر بعضہ بعضاً قرآن مجید کا بعض خود اس کے بعض کی تفسیر کرتا ہے۔

ذکر کی بحث | ایک دوسری مثال یہ ہے کہ قرآن مجید میں آیت ہے۔

وَأَذْكُرُوا لِلَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ ۚ وَرَمَّ حَيْدُكُمْ جَنَّةَ دَنُورٍ ۚ فِيهَا كُرُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۚ
 فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ ۚ حَسْبُكُمْ جَنَّةُ دَنُورٍ ۚ فِيهَا كُرُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۚ
 عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ كُنَّا نَسْتَبِينَ ۚ وَكُنَّا نَعْتَرُ ۚ وَكُنَّا نَعْتَرُ ۚ وَكُنَّا نَعْتَرُ ۚ
 مِنْ اتَّقَىٰ وَاتَّقَىٰ اللَّهُ ۚ وَاعْلَمُوا ۚ كَوْنِي كُنَّا نَسْتَبِينَ ۚ وَكُنَّا نَعْتَرُ ۚ وَكُنَّا نَعْتَرُ ۚ
 أَنْتُمْ أَلَيْدٌ تُخْشَوْنَ ۚ سے ڈرتے ہیں۔ تم اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ تم

(البقرہ) اس کے ہی پاس جمع ہوں گے۔

اس آیت میں جو لفظ ذکر آیا ہے اس سے مراد تمام ائمہ تفسیر کے نزدیک ایام حج میں بمقام منیٰ رمی جمار کرنا ہے۔ اور ایام معدودات سے مراد ایام تشریق ہیں یعنی ماہ ذی الحجہ کی ۱۱، ۱۲، اور ۱۳ تاریخیں۔ اب ایک کج بحث آدمی کہہ سکتا ہے کہ لغت میں تو ذکر کے معنی فقط یاد کرنا ہیں، آپ کس طرح ذکر سے مراد ایک مخصوص فعل عبادت (رمی جمار) لے سکتے ہیں۔ اسی طرح معدودات جمع قلت کا صیغہ ہے جو تین سے نو تک پر بولا جاتا ہے، اس میں چند خاص دنوں کا ذکر نہیں اگر اس پر الف لام تعریف کا داخل ہوتا تو اس کو عہد کا مراد لے کر تخصیص پیدا کر سکتے تھے۔ لیکن ایام اور معدودات دونوں نکرہ ہیں۔ پھر ان سے کیونکر چند خاص دن مراد ہو سکتے ہیں اگر کسی شخص نے سال کے چند غیر معین ایام میں بھی خدا کو کسی طرح یاد کر لیا ہے تو اس نے اس آیت کا حکم پورا کر دیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں بیشک لغت میں ذکر کے معنی یاد کرنا ہی ہیں لیکن قرآن مجید کا یہ انداز خاص ہے کہ وہ خاص خاص عبادتوں کا نام نہیں لیتا بلکہ ان کی جو اصل روح ہے اس کا ذکر کر دیتا ہے۔ اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو اس عبادت کی اصل غرض معلوم ہو جائے اور وہ اس سے کسی وقت میں بھی غافل نہ ہوں۔ دیکھئے! عرفات سے واپس ہو کر مزدلفہ میں قیام

کرنے کا حکم ہے۔ اس کو یوں بیان فرمایا گیا۔

فَاِذَا اَفَضْتُمْ مِنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا
اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوْهُ
كَمَا هَدَاكُمْ وَاِنْ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهِ
لَمِنَ الضّٰلِّیْنَ۔ (البقرہ) پہلے سے بے خبر تھے۔

اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ محض زبان سے خدا کو یاد کر لینا یا غیر شرعی اعمال کر کے ذکر اللہ کے فریضہ سے سبکدوش ہونے کی کوشش کرنا بالکل بے سود بلکہ گمراہی ہے، ذکر وہی معتبر ہے جو خدا نے اپنے رسولِ برحق کے ذریعہ مخصوص طرقِ عبادت کے ساتھ لوگوں کو بتایا ہے اسی مضمون کی طرف آیتِ ذیل میں توجہ دلائی گئی ہے۔

فَاِذَا اٰمَنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ
كَمَا عَلَّمَكُمْ مَا لَمْ تَكُوْنُوْا
تَعْلَمُوْنَ۔ (البقرہ) طریقہ جو تم نہیں جانتے تھے۔

صبح و شام کی نمازوں کو بھی ذکر سے تعبیر کیا گیا ہے، ارشاد ہے۔

وَ اذْكُرْ اِسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاٰخِرًا
تم صبح شام اللہ کے نام کو یاد کرو،

ہاں اس میں شبہ نہیں کہ قرآن مجید میں متعدد مقام پر ذکر سے مراد کوئی خاص عبادت نہیں

بلکہ صرف یاد کرنا ہے جیسے آیاتِ ذیل میں۔

(۱) وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْحَمُوْنَ
اور اللہ کو تم کثرت سے یاد کرو تاکہ فلاح پاؤ،

(۲) وَاذْكُرْ اِسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ
تم اللہ کو یاد کرو اور اس کی طرف یکسو

اِلَيْهِ تَبَتَّلْ۔ ہو جاؤ۔

(۳) رِجَالٌ لَا تُلْهِيْهُمْ تِجَارَةٌ وَّكَلٰ
وہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کو اللہ کی یاد سے نہ تو تجارت

بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ۔ غافل کرتی ہے اور نہ خرید و فروخت۔

لیکن قرآن مجید میں جہاں جہاں لفظ ذکر آیا ہے ان سب مقامات کو پیش نظر رکھنے سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ جن مواقع میں ذکر مطلق نہیں بلکہ کسی خاص زمانہ یا مکان کی قید کے ساتھ آیا ہے وہاں مطلقاً یاد کرنا نہیں بلکہ کوئی خاص طریقہ عبادت مراد ہوتا ہے پھر وہ طریقہ عبادت کیا ہوتا ہے؟ اس کی تفصیل یا تبیین یا خود قرآن مجید کرتا ہے یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے قول یا عمل سے اس کا بیان کر دیتے ہیں۔ صورتِ ثانی میں یہ ماننا لازمی ہوگا کہ قرآن نے جو کچھ کہا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مراد متعین کر دی ہے جس سے انحراف کرنا کسی طرح جائز نہیں ہوگا اور اس فعلِ نبوی کو عمل میں لائے بغیر اگر قرآن مجید کے لفظوں کو لغوی معانی کے اعتبار سے کوئی عملی شکل دی گئی تو وہ یقیناً نامعتبر ہوگی۔

اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آیت زیر بحث یعنی "واذکر اللہ فی ایام معدودات" میں ذکر کو چونکہ "ایام معدودات" کے ساتھ مقید کیا گیا ہے، اس لئے یہاں ذکر سے مراد صرف زبان و قلب سے یاد کر لینا نہیں بلکہ کوئی مخصوص طریق عبادت ہے، وہ کیا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اپنے اقوال مبارکہ اور عمل مقدس سے واضح کر دیا ہے کہ وہ "رمی جمار" ہے۔

اب رہی "ایام معدودات" کی بحث تو اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ یہ دونوں لفظ اگرچہ نکرہ ہیں لیکن آیت کا سیاق و سباق بتاتا ہے کہ ان سے مراد چند خاص دن ہیں، وہ دن کون سے ہیں؟ ان کا بیان بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، اس بنا پر اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ تم ایام تشریق میں رمی جمار کرو، پس وہ شخص جو اس آیت کو اس کے ظاہری معنی پر محمول کر کے یہ سمجھتا ہے کہ خدا کو کسی طرح بھی چند دنوں میں یاد کر لینا اس آیت کے حکم کو پورا کر دیتا ہے اور اس کے لئے رمی جمار و ایام تشریق کی کوئی قید نہیں وہ یقیناً فہم قرآن سے بہت بعید ہے اور راہِ حق سے بے شبہ منحرف ہے۔

احکام قرآنی | پھر جس طرح قرآن مجید کے مفرد الفاظ کے معنی کی تعیین کے لئے یہ ضروری ہے
 میں بصیرت | کہ وہ لفظ قرآن میں جہاں جہاں آیا ہے ان سب مواقع کو پیش نظر رکھا جائے
 سی طرح کسی آیت سے کوئی حکم استنباط کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ حکم قرآن مجید میں جتنے
 مواقع میں بیان کیا گیا ہے۔ ان سب کو ملحوظ رکھا جائے اور ہر ایک موقع کے سیاق و سباق پر
 مبصرانہ نگاہ ڈال کر اس حکم کی اصل روح تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔

اس موقع پر یہ عرض کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ قرآن مجید کی مثال جدید زمانہ کی کسی مرتبہ
 مہذب قانونی کتاب کی نہیں ہے، جس میں تمام احکام مختلف ابواب اور پھر ہر باب کے
 ذیل میں مختلف دفعات کے ماتحت ترتیب اور ایک خاص نظم و نسق کے ساتھ بیان کر دیے جاتے
 ہیں بلکہ اس کی مثال اس طبیب حاذق کی سی ہے جو مریض کے لمحہ بہ لمحہ متغیر ہونے والے احوال
 کو دیکھ کر نسخہ میں ترمیم و تنسیخ کرتا رہتا ہے اور یا وہ فوج کے اس قائد کی طرح ہے جو طریق جنگ
 کی مصلحتوں اور فریق مخالف کی مورچہ بندیوں اور اصول اقدام و تاخر کے پیش نظر کبھی فوج
 کو کسی محاذ پر لڑنے کی ہدایت کرتا ہے اور کبھی کسی دوسرے محاذ پر جنگ کرنے کا حکم دیتا ہے
 کبھی وہ تلوار استعمال کرتا ہے اور کبھی بندوق یا توپ، کبھی وہ آگے بڑھنے کا حکم دیتا ہے اور
 کبھی فوج کو مصلحتاً پیچھے ہٹاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب احکام اپنی اپنی جگہ نہایت ضروری اور
 واجب العمل ہیں۔ سطحی طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک حکم دوسرے حکم کے منافی ہے
 یا ایک نسخہ دوسرے نسخہ کی ضد ہے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ باہمی تضاد اور منافات کے باوجود
 ان میں کا ہر ایک حکم اور نسخہ اپنے مخصوص موقع و محل کے اعتبار سے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ
 دوسرا اپنے موقع و محل پر۔ اگر ایک کو دوسرے کی جگہ پر رکھ دیا جائے تو اس کا نتیجہ بجز تباہی اور بربادی
 کے اور کیا ہو سکتا ہے اور حق یہ ہے کہ جو دین دنیا میں آخری بن کر آیا ہو اس میں ایسی لچک اور
 تنوع احکام کا ہونا ضروری بھی تھا۔

انسان کی تمام انفرادی اور اجتماعی ضرورتوں پر شامل ہونے کی یہی وہ صفت قرآنی ہے

جس کو حکمت سے تعبیر فرمایا گیا ہے:-

تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْحَكِيمِ

یہ حکمت والی کتاب کی آیات ہیں۔

ایک جگہ ارشاد ہے:-

ذَلِكَ مِمَّا أَوْحَىٰ إِلَيْكَ رَبُّكَ

یہ اس حکمت میں سے ہے جو آپ کے پروردگار

مِنَ الْحِكْمَةِ (ذی اسرائیل)

نے آپ پر نازل کی ہے۔

ذَلِكَ نَتْلُوهُ عَلَيْكَ مِنَ الْآيَاتِ

یہ وہ آیتیں اور حکمت والا ذکر ہے جو ہم تم پر

وَالذِّكْرِ الْحَكِيمِ (ال عمران)

پڑھتے ہیں۔

قرآن مجید کی صفت جامعیت کو ایک دوسرے مقام پر یوں بیان فرمایا گیا۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا

اور ہم نے آپ پر قرآن مجید نازل کیا جو ہر چیز

لِكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ وَ

کو کھول کر بیان کرتا ہے اور جو مسلمانوں کیلئے

بُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ (النحل)

ہدایت، رحمت اور بشارت ہے۔

لیکن جن لوگوں کی طبیعت میں کمی ہوتی ہے وہ اس تنوع احکام کو برداشت نہیں کر سکتے ان کی قوت فکر مختلف احکام کو اپنی اپنی جگہ پر رکھنے سے قاصر ہوتی ہے تو وہ کسی ایک طرف جھک جاتے ہیں اور اپنی طرف سے کسی ایک قطعی حکم کا یقین کر لیتے ہیں اسی قسم کے لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن میں فرمایا گیا ہے

أَفْتَمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ تَكْفُرُونَ

کیا تم قرآن مجید کے بعض حصوں پر ایمان لاتے

بِبَعْضٍ، فَمَا جَزَاءُ مَن يَفْعَلُ ذَلِكَ

ہو اور بعض کو کفر کرتے ہو، تو کیا نہیں ہے اس

مِنْكُمْ إِلَّا الْآخِرَةُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا

شخص کی جزا جو تم میں سے ایسا کرتا ہے مگر دنیا کی

وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ

زندگی میں ذلیل ہونا اور قیامت کے دن وہ

الْعَذَابِ وَفَاللَّهِ بِغَافِلِينَ عَمَّا

لوگ شدید ترین عذاب میں مبتلا کئے جائیں گے

تَعْمَلُونَ (البقرہ)

اور اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے۔

نکتہ | یہاں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ ایسے لوگوں کے لئے دنیا میں رسوا ہونے کا ذکر کیوں کیا گیا ہے؟
 اس کی وجہ وہی ہے جو ہم نے ابھی ذکر کی۔ یعنی یہ کہ لوگ جب قرآن مجید کے مختلف احکام میں
 باہمی توازن و تناسب کو قائم نہیں رکھ سکیں گے اور کسی ایک جہت کی طرف مائل و راغب ہو کر
 ایک ہی حکم کو معمول بہ بنالیں گے تو اس کا نتیجہ بجز اس کے کیا ہوگا کہ انسانی اور اجتماعی ضرورتوں کے
 دوسرے گوشے تشنہ تکمیل رہ جائیں اور وہ اس بنا پر دنیوی تباہ حالی کے قعرِ عظیم میں جا پڑیں جو
 مریض طبیبِ حاذق کی تجویز کے مطابق نوبو نسخوں کو استعمال نہیں کرتا اور صرف ایک ہی نسخہ کے
 استعمال پر جمود کر کے بیٹھ جاتا ہے اس کی امید شفا معلوم!

ناسخ و منسوخ | احکام کے ظاہری تعارض کو دیکھ کر بہت سے مفسرین آیات قرآنی میں ناسخ و منسوخ
 کے قائل ہو گئے ہیں اور اس کو اتنی اہمیت دی گئی ہے کہ بعض علماء نے اس
 موضوع پر بھی مستقل کتابیں تصنیف کر ڈالی ہیں۔ علامہ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں "خاص اس
 موضوع پر اتنے لوگوں نے تصنیفات کی ہیں جن کا شمار نہیں ہو سکتا۔ پھر ایک روایت نقل
 کی ہے کہ حضرت علیؑ نے کسی قاضی سے پوچھا "تم ناسخ و منسوخ کو جانتے ہو؟" اس نے کہا
 "نہیں" آپ نے فرمایا "تم خود بھی ہلاک ہو گئے اور دوسروں کو بھی ہلاک کرو گے" ہماری رائے میں
 اگر یہ مقولہ درست ہے تو اس سے مراد نسخ کے اصطلاحی معنی نہیں ہیں بلکہ موارد احکام مراد ہیں۔

نسخ ہے مفسرین کی مراد | لیکن اگر ناسخ و منسوخ کی معنوی تفسیح کی جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے
 کہ مفسرین نے اگر کسی آیت پر ناسخ و منسوخ کا اطلاق کیا ہے تو محض مجازاً
 کیا ہے ورنہ دراصل کوئی آیت عام اصطلاحی معنی کے اعتبار سے منسوخ نہیں ہے "نسخ" کے معنی
 حقیقی ہیں زائل کر دینا۔ اس بنا پر ایک آیت دوسری آیت کے لئے صحیح معنی میں ناسخ اس وقت
 ہو سکتی ہے جبکہ منسوخ آیت پر عمل کرنا مطلقاً ناجائز قرار دیدیا جائے، حالانکہ قرآن کی کوئی ایک
 آیت بھی ایسی نہیں ہے جس پر مطلقاً عمل کرنا ناجائز ہو۔ مثلاً قرآن مجید میں ایک جگہ مسلمانوں کو

حکم دیا گیا ہے کہ انہیں کفار کے ہاتھوں سے جواذیت پہنچے اس پر صبر کرنا چاہئے۔ مگر دوسرے مواقع میں نہایت پر زور طریقہ پر جہاد کی ترغیب دی گئی ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ
وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ (توبہ)
اے نبی آپ کفار و منافقین کے ساتھ جہاد
کیجئے اور ان پر سخت ہو جائیے۔
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ
يَلُونَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا
اے مومنو! تم ان کفار سے جنگ کرو جو
تم سے قریب ہیں اور چاہئے کہ وہ تم میں
فِيكُمْ غِلْظَةً (توبہ)
سختی محسوس کریں۔

مفسرین نے آیت صبر علی الایذار اور آیات جہاد میں تعارض دیکھ کر آیات جہاد کو آیت صبر کے لئے ناسخ کہا ہے، مگر سوال یہ ہے کہ کیا یہ حقیقتاً نسخ ہے؟ صبر کرنے کا حکم اس زمانہ میں تھا جبکہ مسلمان کمزور تھے اور وہ کفار کو جواب ترکی بہ ترکی نہیں دے سکتے تھے مگر جب خدا نے ان کو طاقت و قوت عطا فرمادی اور وہ جنگ کے قابل ہو گئے تو انہیں جہاد کا حکم دیدیا گیا۔ اس بنا پر ان دونوں آیتوں کے ملا دینے سے دو حکم ثابت ہوتے ہیں۔

(۱) اگر مسلمان کمزور ہوں تو انہیں کفار کے مصائب پر صبر کرنا چاہئے اور اندرونی طور پر کوشش کرنی چاہئے کہ وہ قوی ہو جائیں۔

(۲) پھر جب مسلمان قوی ہو جائیں تو انہیں جہاد کرنا چاہئے۔ اب خاموش بیٹھا رہنا اور کافروں کے مصائب برداشت کرتے رہنا ان کے لئے ناجائز ہے۔

غور کیجئے جب دونوں آیتوں سے مختلف حالات کے مناسب دو مختلف احکام مستنبط ہوتے ہیں تو اب ان میں سے کسی ایک کو دوسرے کے لئے ناسخ کس طرح کہہ سکتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ کسی ایک حکم کو دوسرے حکم کے اعتبار سے نسوخ زبانی یعنی ہنگامی طور پر نسوخ کہہ سکتے ہیں۔ جس طرح طبیب ایک نسخہ کو ملتوی کر کے دوسرا نسخہ لکھتا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ اب پہلے نسخہ کا استعمال سراسر ممنوع قرار دے دیا گیا ہے اور وہ کسی حالت میں

بھی قابل استعمال نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ اب مریض کی موجودہ حالت کے پیش نظر اس کو یہ نسخہ استعمال نہیں کرنا چاہئے، لیکن اگر اس کی حالت اولیٰ عود کر آئے تو ظاہر ہے کہ اس کو پھر وہ پہلا ہی نسخہ استعمال کرایا جائے گا۔

عام طور پر مشہور ہے کہ "سورۃ الکافرون" کی آیت "لکم دینکم ولی دین (تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین ہے) منسوخ التلاوة نہیں منسوخ الحکم ہے، لیکن اگر ذرا غور کیا جائے تو اس کو منسوخ کہنا ہی درست نہیں ہے۔ اس آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کافروں کے اپنے دین پر قائم رہنے پر رضامندی کا اظہار کیا جا رہا ہے جو اس کو منسوخ الحکم قرار دیا جائے بلکہ صورت یہ ہے کہ توحید کا داعی برحق کافروں کو اسلام کی دعوت دیتا ہے اور ایک مرتبہ نہیں بار بار دیتا ہے یہ لوگ اس دعوت کو سن کر صرف اسے قبول کرنے سے انکار ہی نہیں کرتے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمسخر کرتے ہیں اور گستاخانہ برتاؤ برتتے ہیں اور الٹا خود آپ کو اپنا مذہب اختیار کر لینے کی دعوت دیتے ہیں اس پر آپ کو حکم دیا جاتا ہے کہ ان سے صاف صاف کہہ دیجئے کہ اگر تم دعوت اسلام کو قبول نہیں کرتے ہو مت کرو۔ میں بہر حال تمہارے تبوں کی پرستش نہیں کر سکتا۔ تم جانو تمہارا کام "تم کو تمہارا مذہب مبارک ہو اور مجھ کو میرا دین" اب اس تقریر کو ذہن میں رکھ کر پوری سورت پڑھ جائے اور بتائے کہ کیا کسی ایک لفظ سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ کفار کو اپنے دین پر قائم رہنے کی اجازت دیدی گئی ہے۔ اس سورت میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس کا حاصل اس مضمون سے زیادہ نہیں جو ومن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر یا لنا اعمالنا ولکم اعمالکم میں بیان فرمایا گیا ہے، پس اس سورت کی کسی آیت پر عام اصطلاحی معنی کے اعتبار سے نسخ کا اطلاق صحیح ہو ہی نہیں سکتا۔

علامہ محمود آلوسی نے اسی سورت کی آخر آیت میں کئی احتمالات بیان کئے ہیں۔ پہلے احتمال کی بنا پر تو انھوں نے صاف کہا ہے۔

والایۃ علی ما ذکر محکمۃ غیر منسوخۃ اس احتمال پر آیت محکم غیر منسوخ ہے۔

دوسرا احتمال انہوں نے وہی بیان کیا ہے جو ابھی ہم ذکر کر چکے ہیں اور اس کے متعلق بھی آگے چل کر فرماتے ہیں وعلیہ لا نسئح ایضاً اور اس احتمال پر بھی نسخ نہیں ہے۔

اس گفتگو سے مقصد یہ ہے کہ اگر اسی طرح تمام ان آیات میں غور کیا جائے جن کے متعلق نسخ کا ادعا کیا گیا ہے تو یہ حقیقت صاف روشن ہو جائے گی کہ قرآن مجید کی کوئی ایک آیت کسی دوسری آیت سے منسوخ نہیں ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ یا تو لوگوں نے آیت کے کسی لفظ سے کوئی خاص معنی مراد لے کر کوئی حکم خاص استنباط کر لیا ہے اور اس حکم کو چونکہ منسوخ قرار دیدیا گیا ہے اس لئے انہوں نے خیال کیا کہ آیت ہی سرے سے منسوخ ہو گئی ہے، مثلاً قرآن مجید میں ہے۔

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ

تم نے جن عورتوں سے متع کیا ہے تم

أَجُورَهُنَّ فَرِيضَةً (النسا)

ان کو ان کے مقررہ مہر دے دو۔

اس آیت کے لفظ "استمتعتم" سے بعض لوگوں نے نکاح متعہ مراد لیا اور اس کا حکم

منسوخ ہو چکا ہے۔ اس لئے انہوں نے کہا کہ یہ آیت بھی منسوخ حکم ہے، حالانکہ "استمتعتم" سے مراد لطف اندوز ہونا ہے، متعہ سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی آیت میں کوئی حکم عام بیان کیا جاتا ہے اور اس کے بعد کوئی

دوسری آیت آتی ہے جس میں حکم کی کسی خاص موقع و محل کے اعتبار سے تخصیص کر دی جاتی ہے

بعض حضرات اس تخصیص پر بھی نسخ کا اطلاق کر دیتے ہیں، مثلاً عدت کے متعلق ایک آیت ہے۔

وَالَّذِينَ يَتَّقُونَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ

اور وہ لوگ جو تم میں سے مرجائیں اور

أَزْوَاجًا وَصِيَّتَهُنَّ لَا زَوْجًا لَهُمْ

بیویاں چھوڑیں ان پر اپنی بیویوں کے لئے

مَتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرِ إِخْرَاجٍ

وصیت کرتا ہے کہ سال بھر تک ان کو فائدہ

دیں، گھر سے نہ نکالیں۔ (البقرہ)

اس سے بظاہر ثابت ہوتا ہے کہ عدتِ وفات ایک برس ہے۔ ایک دوسری آیت ہے

وَالَّذِينَ يُتَوَقَّونَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ
 اَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ
 أَشْهُرٍ وَعَشْرًا فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ
 فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْنَ فِي
 أَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ - (البقرہ) کوئی الزام نہیں ہے

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ عدتِ وفات ایک سال نہیں بلکہ چار ماہ دس دن ہے۔ اب ان دونوں میں تعارض دیکھ کر بعض اربابِ تفسیر نسخ کے قائل ہو گئے ہیں حالانکہ اگر ذرا تعمق سے کام لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ نسخ یہاں بھی نہیں ہے۔ پہلی آیت میں شوہروں کو حکم کیا جا رہا ہے کہ وفات کے وقت اپنے ورثہ کو اس بات کی وصیت کر جائیں کہ اگر ان کی بیویاں سال بھر تک گھر میں رہنا چاہیں تو انھیں رہنے دیا جائے، اس مدت میں وہ اپنے اعزا و اقربا سے مشورہ کر کے اپنے لئے کوئی اچھا انتظام کر لیں گی۔ اخلاقی اعتبار سے یہ بات کس قدر بُری ہے کہ ایک عورت جو اپنے شوہر کی رفیقہ حیات بن کر عرصہ دراز تک ایک گھر میں ساتھ رہی ہے شوہر کی وفات کے بعد اس کے ساتھ ایسی بیگانگی کا معاملہ کیا جائے کہ غریب کو اس گھر میں ایک سال تک بھی قیام کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔

اب رہا یہ امر کہ عورت کب تک عدت میں بیٹھی اور وہ کب تک کسی دوسرے شخص کے ساتھ نکاح نہیں کر سکتی تو اس کے متعلق دوسری آیت میں صاف طور پر بتا دیا گیا کہ عورت کی مدتِ عدت چار ماہ دس دن ہے (اگر وہ حاملہ نہیں ہے)۔

اب غور فرمائے! ان دونوں میں کیا تعارض ہے جس کی وجہ سے نسخ کا قائل ہونے کی ضرورت ہو۔ چنانچہ حضرت مجاہد بن جبر جو مشہور مفسر ہیں ان دونوں آیتوں میں نسخ کے قائل نہیں تھے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ "الفوز الکبیر فی علوم التفسیر" میں ان ہی آیات پر

کلام کرنے کے بعد فرماتے ہیں:-

"اللہ تعالیٰ کا قول والذین یتوفون الآیہ جمہور مفسرین کے نزدیک اربعہ اشھر و عشرہ
والی آیت سے اور وصیت میراث و سکنی کے حکم سے منسوخ ہے، لیکن ان دونوں میں
تطبیق اس طرح دی جاسکتی ہے کہ متوفی کے لئے تو وصیت کرنا مستحب یا جائز ہے،
البتہ عورت پر یہ واجب نہیں ہے کہ وہ وصیت کے مطابق رہے۔ حضرت ابن عباسؓ

بھی اسی کے قائل تھے اور یہی توجیہ آیت سے ظاہر ہوتی ہے۔ (ص ۱۹)

قرآن میں نسخ کی حقیقت | خلاصہ کلام یہ ہے کہ کسی آیت کو کسی آیت کے لئے ناسخ کہنے سے اگر مراد
یہ ہے کہ منسوخ آیت کا حکم بالکل زائل ہو چکا اور اب اس پر عمل کرنا قطعی طور پر ممنوع قرار دیدیا
گیاہے تو جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا اس معنی کے اعتبار سے کوئی آیت منسوخ نہیں ہے اور اگر برسبیل
مجاز تخصیص عام، یا تعین مدت، یا تفصیل اجمال پر نسخ کا اطلاق کیا جاسکتا ہے تو ہمیں اس کے
تسلیم کرنے میں عذر نہیں کہ اس معنی کے لحاظ سے نسخ کا اطلاق ہو سکتا ہے اور غالب یہ ہے کہ
علماء اسلام جو نسخ بولتے ہیں اس سے وہ دوسرے معنی ہی مراد لیتے ہیں۔
حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں:-

مراد عامۃ السلف بالناسخ والمنسوخ ناسخ و منسوخ سے عام سلف کی مراد کبھی حکم کا
رفع الحکم بجملة تارة وهو اصطلاح تمامہ مرفوع ہو جانا ہوتا ہے، یہ متاخرین کی اصطلاح
المتاخرین و رفع دلالة العام المطلق ہے اور کبھی نسخ سے مراد ہوتی ہے عام، مطلق ظاہر
والظاہر غیرہا تارة اما بتخصیص وغیرہ کا رفع کر دینا خواہ وہ تخصیص کے ذریعہ ہو
او تقیید او حمل مطلق علی مقیدو یا تقیید کے یا مطلق کو مقید پر محمول کرنے اور
تفسیرہ و تبیینہ حتی انھم سیمون اس کی تفسیر و بیان کے ذریعہ یہاں تک کہ چیخرا
الاستثناء والشرط والصفة نسخا استثناء شرط اور صفت کو بھی نسخ کہہ دیتے ہیں

لتضمن ذلك رفع دلالة الظاهر و کیونکہ دلالت ظاہر کے رفع اور بیان مراد کو
 بیان المراد فالنسخ عندهم و فی متضمن ہوتا ہے، پس نسخ ان کے نزدیک اور ان
 لسانہم ہو بیان المراد بغیر ذالک کی زبان میں اس لفظ کے غیر سے مراد کا بیان
 اللفظ بل بامر خارج عنہ ومن تامل کر دینا ہے، اور غیر لفظ ہی نہیں بلکہ کبھی مراد کا
 کلام مراد ہی من ذلك فیہ ما لا بیان کسی امر خارج سے بھی ہو جاتا ہے جو شخص ان
 یحیی و زال عنہ بہ اشکالات اسلادہ کے کلام میں تامل کرے گا اس کو اس
 او جبرہا حمل کلام مراد علی الاصطلاح میں غیر محدود فوائد نظر آئیں گے اور اس سے وہ
 الحادث المتاخر۔ اشکالات زائل ہو جائیں گے جو نسخ کو اصطلاح
 حادث و متاخر پر محمول کر کے پیش آتے ہیں۔

۱۰

علامہ ابن حزم ظاہری نے ایک اور نکتہ پیدا کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ نسخ کی حقیقت بجز
 اس کے کچھ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کوئی چیز کسی مدت کے لئے حرام کرے (اگرچہ وہ مدت ہم کو
 نہیں بتائی جاتی لیکن وہ اللہ کے علم میں ہوتی ہے) پھر وہ اس کو مباح کر دیتا ہے یا اس کے
 برعکس کوئی چیز کچھ مدت کے لئے مباح ہوتی ہے۔ پھر اس کی مدت گزرنے پر اس کو حرام کر دیا جاتا
 ہے یعنی یہ نہ کہنا چاہئے کہ ایک حکم نے دوسرے کو نسخ کر دیا بلکہ یہ تعبیر زیادہ صحیح ہوگی کہ ایک حکم
 کے بعد دوسرا حکم نازل ہو کیونکہ نسخ بمعنی حقیقی تو یہ ہے کہ پہلا حکم باقی ہو اور پھر دوسرا حکم اس کو مرفوع
 کر دے اور ظاہر ہے کہ اس قول کے بموجب یہاں یہ صورت نہیں ہے۔ علامہ کے اپنے الفاظ یہ ہیں

وما ہذا شیء اصلاً الا ان الله اور یہاں بجز اس کے کوئی شے نہیں ہے کہ
 تعالیٰ اراد ان یحرم علینا بعض اللہ تعالیٰ نے اپنی بعض مخلوق چیزوں کو ہم پر کچھ
 ما خلق مدة فائمه اراد تعالیٰ مدت کیلئے حرام کرنے کا ارادہ کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے
 ان یسیحہ و اراد ان یبیحہ لنا چاہا کہ اس کو مباح کر دے اور اللہ نے اپنی بعضی

بعد ما خلق مدة فآثم اراد تعالیٰ مخلوق کو کچھ مدت کیلئے ہمارے واسطے مباح کرنے کا
ان یجرمہ علینا۔ ۱۵۹ ارادہ کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ اس کو ہم پر حرام کر دے۔

علامہ ابو بکر حصص فرماتے ہیں "نسخ کے معنی لغت میں خواہ کچھ ہی ہوں بہر حال شرع میں
اس کے معنی حکم یا تلاوت کی مدت کے بیان کر دینے کے ہیں۔ پھر آگے چل کر بعض متاخرین کی
تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"تم جانتے ہو قرآن مجید میں عام بھی ہے اور خاص بھی، محکم بھی ہے اور متشابہ بھی۔ پس وہ
شخص جو قرآن میں نسخ کے وجود کا قائل نہیں ہے گویا وہ قرآن میں عام و خاص اور محکم و
متشابہ کو ہی نہیں مانتا۔ کیونکہ اس کے قول کے مطابق تو یہ لازم آتا ہے کہ تمام آیات کا
ورود ایک ہی شان کا ہو۔"

اس تقریر سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن کی بعض آیات پر جب نسخ کا اطلاق کیا جاتا ہے تو
اس سے مراد ازالہ نہیں ہوتا بلکہ صرف یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ فلاں آیت میں جو یہ حکم بیان کیا گیا
تھا وہ فلاں وقت اور اس زمانہ کے مخصوص حالات کے اعتبار سے تھا۔ اب جبکہ حالات دوسرے
ہیں۔ ان کے لئے حکم یہ ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ فلاں قسم کے احوال کے لئے فلاں حکم ہے اور
فلاں قسم کے احوال کے لئے فلاں حکم۔ اس سے کسی ایک حکم کا مطلقاً ممنوع ہو جانا لازم نہیں آتا
بلکہ یہ تفصیل و تشریح عین کمال دین کی دلیل ہے۔

اصل یہ ہے کہ تمام بحثیں ہوتی رہیں مگر کبھی نسخ کے معنی اور اس کی مراد کی تنفیج کا حقہ
نہیں کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ جن بزرگوں نے نسخ کو مانا ہے وہ خود آیات منسوخہ کی تعداد میں بحد
مختلف ہیں۔ پہلے عوام میں مشہور تھا کہ قرآن مجید میں پانچ سو یا تین سو آیات منسوخ ہیں، کسی نے کہا کہ
صرف پچیس آیات منسوخ ہیں، حضرت ابن عباسؓ سے بعض لوگوں نے روایت کی کہ بیس آیات منسوخ
ہیں، جن کو علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے بھی نظم کر دیا ہے۔ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے

”فوز الکبیر فی اصول التفسیر“ میں نسخ پر مستقل ایک فصل میں بحث کی ہے۔ اس میں آپ علامہ
 بلال الدین سیوطیؒ کی کتاب ”الاتقان“ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ شیخ ابن عربیؒ کے قول کے مطابق
 تقریباً بیس آیات منسوخ ہیں، اس کے بعد فرماتے ہیں ”فقیر را در اکثر بست نظراست“ چنانچہ آپ نے
 ابن عربیؒ کی پوری تقریر نقل کی ہے اور اس پر جا بجا تعقبات کئے ہیں۔ ہم یہاں اس طویل تقریر میں
 سے صرف ایک آیت کا ذکر کرتے ہیں۔ ابن عربیؒ فرماتے ہیں۔

”انہ تعالیٰ کا قول وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَ فِدْيَةَ مَنْسُوحٍ ہے اور اس کے لئے
 نسخ دوسری آیت فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ہے“

حضرت شاہ صاحبؒ اس پر تعقب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ اس کو نسخ کہنا صحیح نہیں۔ میرے
 نزدیک اصل صورت یہ ہے کہ ”یطیقونہ“ میں جو ضمیر منصوب ہے وہ صوم کی طرف نہیں بلکہ طعام
 کی طرف راجع ہے اور فدیہ سے مراد فدیہ صوم نہیں بلکہ صدقۃ الفطر ہے۔ اس بنا پر اس آیت کے
 معنی یہ ہو گئے کہ جو لوگ طعام مسکین دینے کی طاقت رکھتے ہیں، انھیں صدقۃ الفطر ادا کرنا ضروری
 ہے، طعام یہاں اگرچہ لفظوں میں مقدم نہیں ہے، لیکن رتبہ مقدم ہے۔ اس لئے انصار قبل الذکر
 بھی لازم نہیں آتا۔ حضرت شاہ صاحبؒ ابن عربیؒ کی تقریر پر اسی طرح تعقبات کرتے چلے گئے ہیں
 اور بالآخر فرماتے ہیں۔

قلت وعلى ما حررنا لا يتعين في كتماننا ههنا تحريك المطابق نسخ صرف

النسخ الا في خمس آيات - پنج آیات میں ہے۔ (ص ۱۸-۲۱)

آپ کے بعد مفتی محمد عبدہ المصریؒ کا زمانہ آیاتوا نصوصوں نے کہا کہ قرآن مجید میں ایک آیت

بھی منسوخ نہیں ہے۔

ہم سمجھتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ نسخ کے اصل مفہوم کی جتنی تفسیح ہوتی رہی، آیات منسوخ

کی تعداد میں بھی اسی کے مطابق کمی واقع ہوتی رہی، یہاں تک کہ یہ حقیقت خود بخود واضح ہو گئی کہ دراصل قرآن مجید

میں ایک آیت بھی منسوخ نہیں۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ہماری تقریر سے یہ شبہ نہ ہونا

چاہئے کہ ہم نسخ کے بالکل قائل ہی نہیں ہیں، اصل یہ ہے کہ جس مذہب میں اشخاص اور قوموں کی تدریجی اور حالات و نفسیات کے مطابق اصلاح کا کامیاب اصول پیش نظر رکھا گیا ہو، اس میں نسخ کا ہونا ناگزیر ہے۔ نسخ کی دو قسمیں ہیں۔ نسخ آیات اور نسخ احکام، ہم اس میں سے دوسری قسم کے نسخ کے قائل ہیں۔ نسخ آیات کے نہیں۔ پھر نسخ احکام کی دو صورتیں ہیں۔ اول یہ کہ ایک حکم دوسرے حکم کو بالکل رفع کر دے جیسے کہ متعنی کی اباحت کا حکم جو قطعی طور پر زائل کر دیا گیا ہے، یا حضرت رسالت کا یہ ارشاد:-

كنت نهيتكم عن زيارة القبور
 الا قروا وروها
 میں پہلے تم کو قبروں کی زیارت سے منع کرتا تھا۔ اب تم ان کی زیارتیں کرو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد آپ کے پہلے ”حکم تحریم زیارت قبور“ کے لئے ناسخ ہی دوسری صورت یہ ہے کہ نسخ بمعنی تفصیل جمال تبیین مبہم اور تغدید مطلق ہو، نسخ احکام ان دونوں معنوں کے اعتبار سے سنت میں تو پایا جاتا ہے، لیکن قرآن مجید میں صرف دوسرے معنی کے ہی اعتبار سے یہ نسخ پایا جاتا ہے، جیسا کہ ہم ابھی بیان کر آئے ہیں۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ | آپ فرمائیں گے اگر ایسا ہی ہے تو قرآن مجید کی آیت
 مَا نُنسَخُ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا
 نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلَهَا۔
 ہم کسی آیت کو منسوخ کرتے یا بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر ایک آیت لاتے ہیں۔

کا کیا مطلب ہے؟ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی آیات میں نسخ موجود ہے، اس شبہ کے جواب کی ہو سکتے ہیں۔ یہاں صرف دو کا ذکر کر دینا کافی ہوگا۔

پہلا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں آیت کا لفظ مطلق ہے۔ اس سے صرف قرآن مجید کا حکم یا قرآن مجید کی کوئی آیت ہی مراد لینا صحیح نہیں ہے۔ اس بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ یہاں آیت سے مراد وہ احکام ہیں جو اسلام سے قبل دوسرے ادیان و شرائع کے موجود تھے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ان کو منسوخ کر کے دوسرے احکام بیان کئے جائیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے بلکہ یہ احکام بہ نسبت

احکام سابقہ کے بہتر ہوں گے۔

صاحب تفسیر المنار نے مفتی محمد عبدہ المصری کی ایک طویل تقریر آیت نسخ کی تفسیر کے ذیل میں نقل کی ہے ہم اس کا خلاصہ ذیل میں درج کرتے ہیں۔ اس سے ہماری تائید ہوتی ہے۔

”علمائے انصار کے فہم میں متحیر ہیں جیسا کہ انھوں نے بیان کیا ہے۔ یہاں تک کہ بعض نے کہا ہے کہ ”نسخہا“ کے معنی بغیر نسخ کے آیت کو اس کی اپنی حالت پر چھوڑ دینا ہے اور تم جانتے ہو کہ معنی اگر لغت صحیح بھی ہوں تب بھی اس کی تفسیر کے شایاں نہیں کیونکہ کسی آیت کو بغیر نسخ کے اس کو اپنی حالت پر چھوڑتے ہوئے اس سے بہتر کوئی آیت لانے کے معنی ہی کچھ نہیں صحیح معنی جو آیت کے سیاق کے ساتھ آخر تک متناسب رہتے ہیں یہ ہیں کہ یہاں آیت سے مراد وہ نشانیاں ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ انبیاء کی تائید کرتا ہے، تو اب مراد یہ ہوتی کہ ہم اگر کسی نبی کی نبوت پر دلالت کرنیوالی کسی دلیل کو ترک کر دیتے ہیں تو اس سے بہتر کوئی دوسری دلیل اس کی جگہ قائم کر دیتے ہیں، یا اگر مدت دراز گزر جانے کے باعث ہم اس کو لوگوں کی یاد سے زائل کر دیتے ہیں تو اپنی قدرت کاملہ سے ایک ایسی دلیل اور پیدا کر دیتے ہیں جو پہلی دلیل سے بھی زیادہ قوی اور نبوت کو ثابت کر نیوالی ہو۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے پاس صرف ایک ہی دلیل نہیں ہے جو وہ تمام انبیاء کو عطا فرمائے۔“

دوسرا جواب یہ ہے کہ اچھا مان لیا کہ آیت سے مراد آیت قرآن ہی ہے لیکن ”نسخہ“ کے معنی حکم کو بالکل زائل کر دینے کے نہیں ہیں بلکہ تبدیل حکم کے معنی ہیں جیسا کہ اس کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے۔

وَإِذَا بَدَلْنَا آيَةً مَّكَانَ آيَةٍ
وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَنْزِلُ قَالُوا
إِنَّمَا أَنْتَ مُفْتَرٍ (النحل)

اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت رکھتے
ہیں اور اللہ جس چیز کو نازل کرتا ہے اس کو بہتر جانتے
والا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں آپ افترا بانڈھنے والے ہیں۔

اس تبدیل آیت بالآیت کا مفہوم کیا ہے؟ یہ کہ ایک زمانہ میں کسی حکم خاص کے لئے کوئی آیت نازل ہوئی، پھر جب حالات بدل گئے تو دوسری آیت نازل ہوئی اور اس میں حکم جدید کا امر فرمایا گیا۔ اس کا آل یہ ہوا کہ دو مختلف حالات کے اعتبار سے دو مختلف احکام نازل ہوئے، اور دونوں اپنی اپنی جگہ برحق اور درست ہیں مسلمان کمزور تھے۔ کافروں اور مشرکوں کی مقاومت نہیں کر سکتے تھے تو صبر کا حکم نازل ہوا، پھر جب وہ قوی ہو گئے تو انھیں جہاد کرنے کا حکم دیدیا گیا یہ دو حکم ہیں جو جس طرح پہلے درست تھے اب بھی ہیں جس طرح قابل عمل پہلے زمانہ میں تھے اب بھی ہیں۔ تبدیل آیت بالآیت کی حقیقت یہ ہے اور بس، کفار و مشرکین اس تنوع احکام کو برداشت نہیں کر سکتے۔ طعن و تشنیع کرنے بیٹھ جاتے ہیں اور کہنے لگتے ہیں کہ آپ کبھی کوئی حکم دیتے ہیں اور کبھی کوئی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ اپنی مصلحتوں کو بہتر جانتا ہے، اسے معلوم ہے کہ کب اور کس وقت کونسا حکم ہونا چاہئے اور کس وقت کونسا۔ پس دوسرے جواب کا لپ لہا یہ ہے کہ آیت بالآیس جو حقیقت بیان فرمائی گئی ہے وہی غائب و غایب آیت میں بھی بیان کی گئی ہے۔ اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں نسخ بمعنی ازالہ حکم مطلقاً پایا جاتا ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر کے ماتحت جو تقریر کی ہے اس سے بھی اس کی ہی تائید ہوتی ہے، فرماتے ہیں:-

”جانتا چاہئے کہ احکام شرعیہ میں نسخ کا حال احکام تکوینی میں نسخ جیسا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ تمام احکام الہیہ خواہ شرعی ہوں یا تکوینی لوح محفوظ میں موجود اور ثابت ہیں اور ان کی دو قسمیں ہیں: احکام خاص، احکام عام، پھر جو احکام خاص ہیں ان کی دو قسمیں ہیں وہ یا تو کسی ایک شخص یا چند اشخاص کے ساتھ مخصوص ہوں گے اور یا کسی زمانہ کے ساتھ مخصوص ہوں گے، خواہ وہ زمانہ قلیل ہو یا کثیر۔ پس جو احکام کسی شخص کے یا زمانہ کے ساتھ مخصوص ہوں گے وہ اس شخص اور زمانہ کے باقی رہنے تک باقی رہیں گے۔ احکام میں یہ تغیر و

تبدل ہمارے اعتبار سے ہے ورنہ خدا کے نزدیک سب احکام برابر ہیں۔ (تفسیر عزیزی ۲۹۲)

ناسخ و منسوخ کی بحث یہاں ضمناً آگئی ورنہ دراصل اس بحث کے لئے مستقلاً ایک ضخیم کتاب درکار ہے، مقصد صرف یہ ہے کہ وہ شخص جو فہم قرآن کی سعادت سے بہرہ اندوز ہونا چاہتا ہے اس کے لئے جس طرح یہ ضروری ہے کہ مفردات قرآن کے معانی کی تعیین کے لئے خود قرآن کی طرف رجوع کرے، اسی طرح استنباط احکام کے لئے ضروری ہے کہ کسی چیز کے متعلق قرآن مجید میں جتنے احکام آئے ہیں ان سب کو یکجا کر کے ان میں باہمی تناسب و توازن پیدا کرنے کی کوشش کرے اور یہ معلوم کرے کہ کونسا حکم کس زمانہ کے لئے تھا اور کونسا کس زمانہ کے لئے، ایک کا مورد و محل کیا ہے اور دوسرے کا کیا؟ ایک کا کیا منشا ہے اور دوسرے سے کیا مراد ہے؟ قرآن مجید میں اگر غور کرنے والا احکام متنوعہ کے ان باہمی فروق کو نظر انداز کر کے ان میں ایک خاص توازن و تناسب پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرے گا تو قدم قدم پر اس کو مشکلات پیش آئیں گی اور کہیں وہ "ناسخ و منسوخ" کہہ کر اپنی گلو خلاصی کا سامان کرے گا اور کہیں ایسی ریکٹ تاویل و توجیہ کرے گا جو قرآن کے منشا کے برعکس ہوگی۔

تفسیر و تاویل کا فرق | اس موقع پر ضروری ہے کہ تفسیر و تاویل کا فرق بھی معلوم کر لیا جائے تفسیر "فسر" سے مشتق ہے جس کے معنی کھولنے اور بیان کرنے کے ہیں۔ اور "تاویل" کا مادہ "اشتقاق" ہے "اول" جس کے معنی لوٹنے اور رجوع کرنے کے ہیں۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ "ایالت" سے مشتق ہے جس کے معنی سیاست ہیں۔ تاویل کرنے والا بھی چونکہ کلام کی سیاست و واقف ہو کر اس کو اپنے موضوع و محل میں رکھتا ہے، اس لئے اس متکلم کو "موویل" اور اس کے اس فعل کو "تاویل" کہتے ہیں۔ لیکن یہ وجہ ضعیف ہے۔ مکالمیخفی علی من له بصیرة فی مناہج استعمال الالفاظ ابو عبید اور ایک گروہ کا خیال تو یہی ہے کہ تفسیر و تاویل باعتبار معنی ایک ہیں لیکن دراصل یہ صحیح نہیں ہے۔ ابن حبیب نیشاپوری بر سبیل طنز کہتے ہیں۔

"ہمارے زمانہ میں ایسے مفسر پیدا ہو گئے ہیں کہ اگر ان سے تفسیر و تاویل میں فرق

دریافت کیا جائے تو انہیں پتہ بھی نہ چلے۔ (شرح احیاء العلوم ج ۲ ص ۵۳۵)

امام راغب اصفہانی تفسیر و تاویل میں عام خاص مطلق کی نسبت بتاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ تفسیر کا اطلاق بیشتر الفاظ و مفردات کلام پر ہوتا ہے اور تاویل کا جملوں اور معانی پر اور دوسرا فرق یہ بیان کرتے ہیں کہ تاویل عموماً کتب الہیہ میں ہوتی ہے اور تفسیر کتب الہیہ وغیر الہیہ دونوں میں۔ لیکن ہمارے خیال میں زیادہ دلپسند اور صحیح فرق وہ ہے جو ابو طالب الثعلبی نے بیان کیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ تفسیر کے معنی لفظ کی وضع کا بیان کر دینا ہے خواہ وہ حقیقت ہو یا مجاز مثلاً "صراط" کے معنی راستہ "صیب" کے معنی بارش اور "کفر" کے معنی انکار۔ اور تاویل کہتے ہیں باطن لفظ کی تفسیر کرنے کو۔ گویا تاویل کے معنی ہیں حقیقت مراد کی خبر دینا، اور تفسیر کے معنی ہیں دلیل مراد کی خبر دینا، کیونکہ لفظ کا شرف مراد ہونے کے لحاظ سے دلیل مراد ہوتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ قرآن مجید میں ہے ان رَبَّنَا لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ اس کی تفسیر تو یہ ہے کہ "مرصاد" رصدا سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں گھات میں رہنا اور نگرانی رکھنا۔ اس لئے مطلب یہ ہوا کہ تمہارا رب تمہارے اعمال کی دیکھ بھال رکھتا ہے۔ اس کی تاویل یہ ہے کہ ہم کو پرے اعمال سے بچنا چاہئے اور احکام خداوندی کی تعمیل میں تکامل و تہاون سے کام نہ لینا چاہئے۔

بعض لوگوں نے اس مفہوم کو اس طرح بیان کیا ہے کہ قرآن مجید میں جو چیز بیان کی گئی اور صحیح سنت میں جس کی تعیین کی گئی ہے اس کو ظاہر کر دینا تفسیر ہے۔ کسی شخص کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے اجتہاد سے ان میں کوئی جدت پیدا کرے ورنہ وہ تفسیر بالرائے ہو جائیگی۔ جس کی ممانعت کی گئی ہے اور تاویل ان احکام کو کہتے ہیں جن کا استنباط وہ علماء کرتے ہیں جو خطاب کے نشیب و فراز سے پوری طرح باخبر ہیں۔ اور جو علوم و فنون میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ علامہ نجوی وغیرہ نے تاویل کی تعریف یہ کی ہے۔

التاویل صرف الایۃ الی معنی تاویل آیت کا لٹا دینا ہے ایک ایسے معنی کی موافق لما قبلہا وما بعدہا احتملاً طرف جو باقیں اور ما بعد کے موافق ہو اور وہ الایۃ غیر مخالف کتاب السنۃ معنی قرآن و سنت کے مخالف نہ ہوں اور ایسے

من طریق الاستنباط سے معانی پیدا کرنا ازراہ استنباط ہوگا۔

سطورہ بالا میں تفسیر و تاویل سے متعلق جو اقوال نقل کئے گئے ہیں، ان سے یہ واضح ہوا ہوگا کہ تفسیر کا دار و مدار بڑی حد تک علم لغت، معانی اور ادب پر ہے مگر تاویل یعنی قرآن مجید کی آیت کا صحیح مصداق متعین کرنے کے لئے صرف ان ہی علوم کی ضرورت نہیں بلکہ ضروری ہے کہ تاویل کرنے والا شریعت کے اسرار و حکم، رموز و غوامض اور اس کے احکام و مسائل سے پوری طرح واقف ہو اور استنباط مسائل کے جو اصول ہیں ان میں نہایت و کمال کا مرتبہ رکھتا ہو۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ شعراءِ فارس اپنے کلام میں تصوف کے مضامین کثرت سے بیان کرتے ہیں۔ لیکن بقول مرزا غالب

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو منتی نہیں ہے بادۂ وساغریٰ کے بغیر

یہ شعراءِ متصوفین شراب بولتے ہیں اور اس سے شرابِ معرفت، ساقی سے مرشد کامل اور شاہد سے شاہدِ حقیقی مراد لیتے ہیں، اس بنا پر جو شخص فارسی شاعری کی تاریخ، اس کی عہد بعہد ترقی اور شعراء کے اسالیب کلام سے واقف ہوگا اس کو شاعر کی صحیح مراد سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آئیگی۔ اس کے برخلاف وہ شخص جو ان اسالیب سے واقف نہیں اور صرف زبانِ فارسی جانتا ہے وہ اشعار کا مطلب وہی سمجھے گا جو ان کے ظاہری و لغوی معانی سے مفہوم ہوتا ہے۔ پس اسی طرح دراصل تاویل کا اہل وہی شخص ہے جو شریعتِ اسلام کے تمام سرچشموں سے باخبر ہے اس کے بغیر اگر کوئی فہم قرآن کا ادعا کرتا ہے تو اس کا لغزشوں اور ٹھوکروں سے بچا رہنا نہایت مشکوک ہے، قرآن مجید میں ایک آیت ہے:-

الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ
بِظُلْمٍ أُولَٰئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَهُمْ
مُتَّذِرُونَ۔ (الانعام)

وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اپنے
ایمان کو ظلم سے آلودہ نہیں کیا، ان ہی کے
لئے امن ہے اور وہ سید سے راستہ پر ہیں۔

اس آیت میں جو لفظ "ظلم" آیا ہے اس سے اگر لغوی معنی مراد لئے جائیں یعنی وضع الشئ فی غیر محلہ تو سرگناہ صغیرہ و کبیرہ اس کے ماتحت داخل ہو جاتا ہے اور سوائے انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے کون ہے جس نے ایک مرتبہ بھی کسی گناہ کا ارتکاب نہ کیا ہو تو اب اشکال یہ پیش آتا ہے کہ پھر اس آیت کا مصداق کون لوگ ہیں؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ظلم کے معنی لغوی مراد نہیں ہیں۔ اب لامحالہ ظلم کے معنی کی تعیین کرنے کے لئے آپ خود قرآن یا سنت کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہیں۔ چنانچہ ایک روایت ملتی ہے کہ صحابہ کرام کی ایک جماعت نے اس آیت کو سن کر سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم میں سے کون ہے جس نے اپنے نفس پر ظلم نہ کیا ہو؟ آپ نے فرمایا یہاں ظلم سے مراد "شُرک" ہے۔

ہم اپنی بحث کے اس حصہ کو حضرت شاہ ولی اللہ کی ایک عبارت پر ختم کرتے ہیں جس میں پوری بحث کا خلاصہ بڑے اختصار اور جامعیت کے ساتھ آگیا ہے حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں

"قرآن عربی زبان میں برا و راست نازل ہوا۔ اہل عرب اپنے خداداد سلیقہ کے مطابق منطوق کلام کو سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں کرتے تھے جیسا کہ خود قرآن مجید میں ارشاد ہے "والکتاب المبین" کھلی اور واضح کتاب" ایک اور جگہ ارشاد ہے "قرآناً عربیاً لعلکم تعقلون" ایک مقام پر ہے "أحکمت آیاتہ ثم فصلت" یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کی آیات کے معانی و مطالب کے سلسلہ میں صحابہ کرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت کم سوال کرتے تھے لیکن جب یہ طبقہ ختم ہو گیا اور عجم کا عمل دخل بڑھا۔ وہ پہلی زبان (خالص عربیت) متروک ہو گئی تو قرآن مجید کے بعض مقامات کا سمجھنا اور ان کا حل کرنا دشوار معلوم ہونے لگا۔ اب علم نحو اور لغت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ سوالات جوابات کی نوبت آئی اور تفسیر میں کتابیں لکھی جانے لگیں۔"

اس کے بعد حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ قرآن مجید کے فہم میں کن کن وجوہ و اسباب کی بنا پر وقت و دشواری یا غلطی پیدا ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں آپ لکھتے ہیں:-

”قرآن مجید کے کسی لفظ کی مراد تک نہ پہنچ سکنے کے چند وجوہ ہوتے ہیں مثلاً (۱) کسی نادر الاستعمال لفظ کا استعمال۔ اس کا علاج یہ ہے کہ صحابہ اور تابعین اور دوسرے ارباب معانی سے رجوع کر کے اس لفظ کے معنی معلوم کئے جائیں (۲) منسوخ اور ناسخ میں امتیاز نہ کرنا (۳) اسباب نزول کا یاد نہ رکھنا (۴) مضاف یا موصوف کے محذوف ہونے کے باعث (۵) ایک چیز کا کسی دوسری چیز کے ساتھ یا ایک حرف کا کسی دوسرے حرف کے ساتھ۔ ایک اسم کا دوسرے اسم، ایک فعل کا کسی دوسرے فعل کے ساتھ بدل جانا، یا جمع کی جگہ مفرد، مفرد کی جگہ جمع کا رکھا جانا۔ غائب کی جگہ مخاطب۔ یا اس کے برعکس ہونا۔ کبھی تقدیم لاحقہ التأخیر اور تاخیر لاحقہ التقدم، انتشار ضمائر، ایک لفظ سے متعدد معانی کا مراد لیا جانا۔ (۶) کبھی قرآن مجید کے فہم میں دشواری کا باعث تکرار مضمون۔ اطناب یا اختصار و ایجاز ہوتا ہے۔ (۷) کبھی کنایہ، تعریف، تشابہ اور مجاز عقلی اس صعوبت فہم کا باعث ہوتا ہے“

بہر حال اس بحث سے یہ بات واضح ہو گئی کہ قرآن مجید کی فہم کا مرحلہ صرف لغت ادب اور معانی و بیان کی روشنی میں کسی آیت کے مفہوم سمجھ لینے پر ہی ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کی حقیقی مراد و مصداق کو متعین کرنے کے لئے سخت ضرورت ہے کہ فہم قرآن کا طالب شریعت اسلام کے اصل سرچشموں سے کما حقہ واقف ہو، اور ان میں مبصرانہ نگاہ رکھتا ہو، اس واقفیت کے بغیر قرآن مجید کو سمجھنے کی سعی کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی شخص امراء القیس کے اشعار عہد جاہلیت کی تاریخ معاشرت، تہذیب و تمدن، روایات، مزعوہات و توہمات کو جانے پہچانے بغیر سمجھتا چاہے۔

کیا قرآن مجید بغیر سنت کے صحیح معنی میں سمجھ میں آسکتا ہے؟	ہندوستان میں اب ایسے حضرات کی تعداد روز بروز ٹڑھ رہی ہے جو مطالب قرآنی کے صحیح فہم کے لئے احادیث کے علم کو شرط قرار
--	---

نہیں دیتے۔ ان کی رائے میں احادیث ناقابل اعتبار و استناد ہیں اور اس بنا پر ان میں یہ صلاحیت

ہی نہیں کہ تشریح احکام یا تفسیر قرآن میں ان سے مدد لی جاسکے، اس وجہ سے ضرورت ہے کہ اس خاص مسئلہ پر کسی قدر وضاحت کے ساتھ کلام کیا جائے۔

سنت سے احتجاج کا انکار ہمارے دورِ نامسعود کی ہی خصوصیت نہیں بلکہ اس سے قبل بھی کچھ لوگ تھے جو سنت کو قابل احتجاج تسلیم نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ علامہ ابن خرم اندلسی نے اپنی کتاب احکام الاحکام میں فتنہ انکار حدیث کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ دنیا میں اس سے بڑھ کر کوئی اور فتنہ نہیں ہو سکتا کہ آدمی قرآن مجید کو کتابِ الہی مانے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا بھی قائل ہو لیکن اس کے باوجود وہ احادیث و اخبار کی محبت سے انکار کرے۔

علامہ جلال الدین سیوطی نے نویں صدی ہجری کے آخر میں مفتاح الجنۃ فی الاحتجاج نامی کتاب اسی طرح کے ایک منکر حدیث کے رد میں تصنیف فرمائی تھی جو مصر سے شائع ہو چکی ہے۔ لیکن زمانہ کے اوصاف و اطوار کے اختلاف کی وجہ سے ہمارے عہد میں اور اس عہد میں فرق یہ ہے کہ زمانہ گذشتہ میں چونکہ ایمان کامل اور عقائد نچتہ اور تمسک بالشرعیات کا جذبہ مستحکم تھا، اس لئے منکر حدیث پر گوشہ عافیت تنگ ہو جاتا تھا۔ اس کی آواز صدابہ صحرا ہو کر گناہی و عدم قبول کی فضاؤں میں گم ہو جاتی تھی اور عام مسلمانوں میں اس کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ لیکن آج ایک شخص کھڑا ہو کر ڈنکے کی چوٹ احادیث نبوی کا انکار کرتا ہے، ان کی تشریحی و احکامی حیثیت کو تسلیم نہیں کرتا اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ معاذ اللہ کتب حدیث کو "جھوٹ کا موج دریا" کہتا ہے، ان کا استہزار اور تمسخر کرتا ہے۔ سگرٹ کے پف ہوا میں اڑاتے اور اپنے ہونٹوں کو ایک اعمو حاجی جنبش دیتے ہوئے ان پر پھبتیاں کستا ہے اس کے باوجود اس کو لوگ عزت و احترام کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اس کے مضامین کو رسالوں میں جگہ دی جاتی ہے اور اس کو "مجدد ملت" "معمی شریعت" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

"وائے گردِ سپسِ امر و بودِ فردائے"

دین میں مداخلت اور شریعت کی پابندیوں میں تساہل بہتے والی طبیعتیں اس کی آواز پر
لیک کہتی ہیں۔ اور اس طرح وہ چند برگشتہ دماغ نوجوانوں کا ایک حلقہ تیار کر لیتے ہیں۔

قرآن میں اتباع | ان حضرات سے خود ان کے عقیدہ کے مطابق پہلی بات یہ دریافت کرنی چاہئے
رسول کا حکم | کہ قرآن مجید کو تو آپ قابل استناد اور اس کے احکام کو واجب الاتباع مانتے

ہی ہیں۔ اب یہ ارشاد ہو کہ اس باب میں قرآن کا ایک ایک لفظ ایک ایک آیت سب برابر ہیں
یا ان میں کوئی فرق ہے۔ نیز یہ کہ قرآن مجید میں جو اوامر و احکام ارشاد فرمائے گئے ہیں، ان میں
کیا بعض احکام ایسے بھی ہیں جن کا مصداق خارج میں موجود نہیں؟ اگر یہ فرمایا جائے کہ قرآن

کی تمام آیات کا خارج میں مصداق موجود ہے اور وہ سب ہمارے لئے ضروری الاتباع ہیں۔
تو پھر ان آیات کی نسبت کیا کہا جائیگا جن میں صاف طور سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے
نقش قدم پر چلنے اور آپ کے اقوال و افعال پر عمل کرنے کا امر فرمایا گیا ہے۔ مثلاً آیات ذیل

۱۱) فَاٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرِسُوْلِهِ
ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر۔

۱۲) اِيْمَانًا مَّوْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
مومن صرف وہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے

بِاللّٰهِ وَرِسُوْلِهِ
رسول پر ایمان لائے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ایمان بالرسول کے معنی کیا صرف یہ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کی رسالت و نبوت کا اقرار کر لیا جائے اور آپ کے اقوال و افعال سے کوئی سروکار نہ رکھا جائے
اگر ایمان بالرسول کے معنی صرف یہی ہیں تو ایمان باللہ کے معنی بھی یہی ہونے چاہئیں کہ اللہ
کی وحدت اور اس کی ربوبیت کا اقرار کر لیا جائے اور اس کے اوامر و نواہی کی پروا نہ کی جائے
ظاہر ہے کہ جس شخص کو اسلام کے ساتھ دور کا بھی لگاؤ ہے وہ ایمان باللہ و بالرسول کے
یہ معنی سہ گز مراد نہیں لے سکتا بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ اللہ کو واحد و رب مطلق اور رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی برحق یقین کر کے دونوں کے اوامر و نواہی پر عمل پیرا ہونے کا عہد و پیمان
کرتا ہے۔ ورنہ اگر ایمان بالرسول سے مراد صرف آپ کی نبوت و رسالت پر ایمان لانا ہو تو

آپ کی حیثیت محض ایک ایچی اور پیغامبر کی رہ جاتی ہے حالانکہ خود قرآن مجید نے متعدد مواقع پر اس کی صاف تصریح کر دی ہے کہ آپ صرف ایچی نہیں بلکہ قرآن کی مراد کو بیان کرنے والے اور اس کے شارح ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ
إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي
اختلفوا فيه۔ جو اس میں اختلاف کر رہے ہیں۔

اس آیت میں فیہ کی ضمیر مجبور کتاب یعنی قرآن کی طرف راجع ہے۔ اس لئے مطلب یہ ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن محض اسی لئے نازل کیا گیا ہے کہ جب قرآن کے کسی لفظ کے معنی یا حکم میں کچھ لوگ باہم اختلاف کریں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی مراد بیان فرما کر اس اختلاف کا خاتمہ کر دیں یہ منصب آپ کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔

پھر ایک مقام پر فرمایا گیا ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا لِمُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى
اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ
الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ
يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ
ضَلَالًا مُّبِينًا۔

اور جب اللہ اور اس کا رسول کسی امر کا حکم فرمادیں تو اب کسی مومن مرد اور عورت کو اپنے معاملہ میں کوئی اختیار باقی نہیں رہتا اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے وہ کھلا ہوا گمراہ ہے۔

دیکھئے! اس آیت میں جس طرح اللہ کے امر کو واجب الاطاعت اور اس سے سرتابی کو کھلی ہوئی گمراہی قرار دیا گیا ہے، ٹھیک اسی طرح امر رسول کو بھی واجب الاطاعت اور اس کی عدول حکمی کو ضلال مبین فرمایا گیا ہے۔ پس اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت محض ایک ایچی کی ہوتی تو در رسولہ کہنے کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی اور نہ اللہ کی نافرمانی کے ساتھ رسول کی نافرمانی کا ذکر کر کے اس کو کھلی ہوئی گمراہی کہا جاتا۔ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ قرآن مجید پر عمل کرنا ہی اللہ اور

اس کے رسول پر ایمان لانا ہے تو معلوم نہیں اس آیت کا کیا جواب دیا جائے گا جس میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر احسان جتاتے ہوئے صاف طور پر فرما دیا ہے کہ رسول اللہ تمہارے پاس کتاب (قرآن مجید) اور حکمت لیکر آئے ہیں۔

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ
بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ
يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِذْ
كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ

اللہ نے مومنوں پر بڑا احسان کیا کہ اس نے خود ان ہی میں سے ایک رسول پیدا کیا جو ان پر بتلاوا علیہم آیتہم ویزکیہم اللہ کی آیات کی تلاوت کرتا ہے ان کا تزکیہ کرتا ہے ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اگرچہ وہ پہلے سے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

یہ "حکمت" کیا بعینہ کتاب ہے؟ اور کیا "حکمت" کا عطف کتاب پر عطف بیان ہی ہے؟ اربابِ بلاغت جانتے ہیں کہ یہاں موقع عطف بیان کا ہے ہی نہیں، کیونکہ یہاں احسان جتایا جا رہا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد اوصاف کو بیان کرنا مقصود ہے اگر کتاب اور حکمت سے ایک ہی چیز مراد لی جائے تو آنحضرت کے اوصاف میں ایک کی کمی ہو جاتی ہے چنانچہ امام شافعی فرماتے ہیں: میں نے ان بزرگ سے جو اہل علم میں مجھ کو سب سے زیادہ محبوب ہیں سنا ہے کہ اس آیت میں کتاب سے مراد قرآن مجید اور حکمت سے مراد سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ پس اگر حکمت سے مراد غیر کتاب اللہ کوئی دوسری چیز ہے اور از روئے بلاغت حکمت کتاب اللہ مراد ہو ہی نہیں سکتی تو بتایا جائے وہ کہاں ہے اور کیا ہے؟ اور کیا وہ اقوال و افعال نبوی کے سوا کوئی دوسری چیز ہو سکتی ہے؟

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اطِيعُوا اللَّهَ
وَاطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ
مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ
إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ - (النساء)

اے ایمان والو تم اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو اس کے رسول کی اور اپنے اولی الامر کی۔ اور اگر کسی بات میں جھگڑ بیٹھو تو اس کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو۔

اس آیت میں یہ بات قابل غور ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے لئے الگ الگ صیغہ "اطیعوا" لایا گیا ہے لیکن "اولی الامر" کے لئے الگ کوئی صیغہ نہیں لایا گیا بلکہ اس کو صرف "رسول" پر معطوف کر دیا گیا ہے۔ اس میں خاص نکتہ ہے؟ ہو سکتا تھا کہ صرف ایک "اطیعوا" بصیغہ امر لایا جاتا اور رسول اور اولی الامر دونوں کو اللہ پر معطوف کر دیا جاتا۔ اسی طرح یہ بھی ممکن تھا کہ تینوں کے لئے الگ الگ تین صیغے "اطیعوا" کے لئے جاتے، پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ ان دونوں صورتوں میں سے کسی ایک کو اختیار نہیں فرمایا گیا اور اللہ اور اس کے رسول کے لئے تو جدا جدا "اطیعوا" ارشاد ہوا "اولی الامر" کے لئے نہیں۔ اس میں نکتہ بلیغ یہ ہے کہ قرآن مجید کو اصل میں دو مجموعہ قوانین کی طرف اشارہ کرنا ہے ایک وہ جو اللہ کی طرف منسوب ہو کر "کتاب اللہ" اور دوسرا وہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب ہو کر سنت رسول اللہ کہلاتا ہے اور چونکہ اولی الامر (ان سے مراد حکام و ولایة ہوں یا علماء و مجتہدین) کی اطاعت کے لئے الگ کوئی مجموعہ قوانین نہیں ہے بلکہ ان کی اطاعت کے احکام وہی ہیں جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے ماخوذ ہیں اس بنا پر ان کے لئے الگ صیغہ "اطیعوا" نہیں فرمایا گیا چنانچہ آیت کا اخیر حصہ بھی اس پر دلالت کرتا ہے یعنی یہ کہ اگر تم آپس میں جھگڑا کرو (تم میں حاکم اور محکوم دونوں شامل ہیں) تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو، مطلب یہ ہے کہ ان سے فیصلہ طلب کرو۔

اس سے صاف معلوم ہوا کہ ہمارے لئے قابل احتجاج دو چیزیں ہیں، ایک اللہ کا فرمان اور دوسرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد، اگر صرف اللہ کا فرمان یعنی "وہی متلو" ہی لائق استناد ہوتا تو "الرسول" فرمانے کی کیا وجہ ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ درحقیقت رسول کا فرمان بھی اللہ کا ہی فرمان ہے تب بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ اللہ کے ساتھ رسول کے ذکر کا سبب کیا ہے؟

اب ان آیتوں پر غور فرمائیے جن میں صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور آپ کے احکام و اوامر کی پیروی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى
يُحْكَمُوا لَكَ فِي مَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ
لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا
مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا

تیرے رب کی قسم یہ لوگ اس وقت تک مؤمن نہیں
ہوں گے جب تک کہ یہ اپنے اختلافات میں آپ کو
حکم نہیں بنائیں گے اور پھر اس کے بعد آپ کے حکم سے
متعلق وہ اپنے دلوں میں کوئی تنگی بھی محسوس نہیں کریں گے

(النساء) اور پورے طور پر اس کو تسلیم نہیں کر لیں گے۔

بخاری میں حضرت عبداللہ بن زبیر سے روایت ہے کہ ایک انصاری نے حضرت زبیر سے
درخت کو سیراب کرنے کے لئے پانی کے معاملہ میں جھگڑا کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے
یہ معاملہ پیش ہوا تو آپ نے حضرت زبیر سے فرمایا "تم اپنی زمین کو سیراب کر لو، اور اس کے
بعد پانی اپنے پروسی کے لئے چھوڑ دو، اس پر انصاری بولا "زبیر آپ کے پھوپھی زاد بھائی
ہیں نا" یہ سن کر سرور کائنات کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور آپ نے فرمایا "اے زبیر! تم
زمین کو سیراب کرو پھر پانی روکو، یہاں تک کہ وہ دیواروں پر چڑھ جائے۔ زبیر نے فرمایا
میں گمان کرتا ہوں کہ یہ آیت فلا وربك لا يؤمنون الایۃ اسی واقعہ کے سلسلہ میں
نازل ہوئی ہے۔ ۷۵

۱۷ بخاری کتاب التفسیر سورۃ النار۔ ۷۵ اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ ایک مقام پر تو آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ اقدس پر بیعت کرنے کو بعینہ خدا کے ہاتھ پر بیعت کرنا ہی قرار دیا گیا ہے اور
جو لوگ بیعت کرنے کے بعد نقض عہد کریں ان کے لئے وعید شدید اور بیعت کے مطابق عمل کرنے والوں
کے لئے اجر عظیم کا وعدہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ
اللَّهَ مَا يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ فَمَنْ
نَكَثَ فَإِنَّمَا يَنْكُثُ عَلَىٰ نَفْسِهِ وَمَنْ
أَوْفَىٰ بِمَا عَاهَدَ عَلَيْهِ اللَّهُ فَمَنَّا

بے شبہ وہ لوگ جو آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ
خدا سے بیعت کرتے ہیں اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں
پر ہے پھر جو شخص قول توڑتا ہے وہ اپنے نقصان
کیلئے ہی توڑتا ہے اور جو اس چیز کو پورا کرتا ہے

۱۸ جس کا اس نے اللہ سے اقرار کیا ہے تو اللہ اس کو اجر عظیم دے گا۔
آجراً عظیماً۔ (فتح)

ان آیات سے یہ امر بالکل صاف ہو جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی پر عمل کرنا ایسا ہی ضروری ہے جیسا کہ قرآن پر لیکن فرق یہ ہے کہ قرآن نقل متواتر کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے۔ اس بنا پر وہ قطعی الثبوت ہے۔ اور احادیث کا حال یہ نہیں ہے ان میں بہت کم ایسی حدیثیں ہیں جن کو متواتر کہا جاتا ہے۔ پس یہ فرق محض نقل کی قوت و ضعف کی وجہ سے ہے ورنہ اگر کسی حدیث کی نسبت کسی ذریعہ سے بالکل قطعی طور پر یہ ثابت ہو جائے کہ وہ بعینہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے تو وجوب عمل کے اعتبار سے اس میں اول قرآن کی آیت میں کوئی فرق نہیں ہوگا کیونکہ خود قرآن آپ کے متعلق شاہد ہے۔ وما ینطق عن الھوی۔ ان ھو الا وحی یوحی۔

حدیث کی تشریحی حیثیت | ان آیات کا مطالعہ غور سے کرو اور دیکھو کہ منکرین حدیث میں سے جو لوگ حدیث کی تاریخی حیثیت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن اس کو تشریح احکام میں موثر نہیں مانتے انھیں بتانا چاہئے کہ اگر سنت کی حیثیت محض تاریخی ہے تشریحی نہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حکیم اول آپ کے فیصلہ کا واجب اطاعت ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ آخر آیت میں کس تاکید سے فرمایا گیا ہے کہ ”تیرے رب کی قسم یہ مومن ہی نہیں ہوں گے جب تک کہ آپ کے فیصلہ کو بغیر کسی بددلی کے پورے طور پر تسلیم نہیں کر لیں گے۔“

اب دریافت طلب یہ ہے کہ یہ حکم آج بھی موجود ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے اور صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ تک کے لئے تھا تو چونکہ آپ کی حیات میں وحی برابر نازل ہوتی رہتی تھی اور جو بات اہم پیش آتی تھی اس کا جواب قرآن سے مل جاتا تھا اس لئے اس کی ضرورت ہی نہ تھی کہ آپ کو حکم بنانے اور آپ کے ارشادِ سماوی کو تسلیم کرنے کا حکم دیا جاتا۔ لامحالہ یہ مانتا پڑے گا کہ ”ردوہ الی اللہ والرسول“ اور آنحضرت کے فیصلہ کو بے چون و چرا تسلیم کرنے کا حکم آج بھی ایسا ہی موجود ہے جیسا کہ آپ کے عہد میں تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر سنت کا تمام ذخیرہ (معاذ اللہ) ناقابل احتجاج ہے تو پھر ”قصار

رسول کو ادنیٰ پس و پیش کے بغیر تسلیم کرنے اور اس پر عمل کرنے کی صورت کیا ہے؟ اور نزاع برپا ہونے کے وقت رد الی اللہ کے ساتھ رد الی الرسول کیونکر ممکن ہے؟

پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ علامہ ابن قیم کے بقول سنت کا تعلق قرآن کے ساتھ تین طرح کا ہے۔ ایک یہ کہ سنت قرآن کے ساتھ پورے طور پر موافق ہو تو اب اس صورت میں قرآن اور سنت کا ایک حکم پر توار دایسا ہی ہے جیسا کہ مختلف دلیلوں کا کسی ایک مدعا کے لئے جمع ہو جانا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ سنت میں اس چیز کا بیان ہو جو قرآن میں مذکور ہے اور اس کی تفسیر ہو، تیسری صورت یہ ہے کہ قرآن مجید جس حکم کے ایجاب یا تحریم سے خاموش رہا ہو، اس کو سنت میں واجب یا حرام قرار دیا گیا ہو۔

علامہ ابن قیم ان تینوں صورتوں کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ سنت ان تین اقسام سے خارج نہیں ہے۔ اس بنا پر اس کو قرآن کے ساتھ کسی قسم کا تعارض نہیں۔ پس جو سنت قرآن پر کسی طرح بھی زائد ہوگی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایک مستقل تشریح ہے۔ اور اس کی اطاعت واجب اور معصیت حرام ہے اور اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ سنت کو کتاب اللہ پر تقدم حاصل ہے بلکہ آپ کے ارشاد گرامی کی تعمیل تو بعینہ خدا کے فرمان کی بجا آوری ہے جو اس نے اپنے رسول کی اطاعت کے متعلق دیا ہے اور اگر اس قسم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت نہ کی جائے تو پھر آپ کی اطاعت کے کوئی معنی ہی نہیں رہتے اور جو طاعت حضور کے ساتھ مختص ہے وہ کالعدم ہو جاتی ہے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت صرف احکام قرآنی میں ضروری قرار دی جائے اور جس حکم نبوی کے متعلق قرآن خاموش ہو، اس کی اطاعت ضروری نہ ہو تو مخصوص طاعت رسول باقی نہیں رہے گی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے من یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔

جو محققین و مجددین حدیث کو محض ایک تاریخی حیثیت دیتے ہیں انھیں آیت ذیل

بار بار پڑھنی چاہئے۔

لَا تَجْعَلُوا دَعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ
 كَدَعَاءِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ قَدْ يَعْلَمُ اللَّهُ
 الَّذِينَ يَتَسَلَّلُونَ مِنْكُمْ لِوَاذًا
 فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ
 أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ
 عَذَابٌ أَلِيمٌ۔
 فتنہ یا عذاب الیم نہ پہنچ جائے۔

آپ نے دیکھا! اس آیت میں کس وضاحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ رسول اللہ کا ارشاد
 عام بات چیت یا عام ملفوظات کی طرح نہیں ہے کہ ان سے محض تاریخ کا کام لیا جائے
 بلکہ وہ واجب الاتباع ہے اور مخالفون کے صلہ میں "عن" واقع ہو رہا ہے۔ اس لئے معنی
 یہ ہوتے کہ جو لوگ امر رسول سے کتر کر نکل جاتے ہیں ان کو فتنہ یا شر پہنچنے کا اندیشہ ہے، کہاں
 حدیث کی محض تاریخی حیثیت اور کہاں یہ تاکید اکید۔

بہیں تفاوت رہ از کجاست تا کجا!

ایک دوسری آیت ہے۔

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ
 لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ۔
 اور اناری ہم نے تجھ پر یہ یادداشت تاکہ تو کھول دے
 لوگوں کے سامنے وہ چیز جو اتری ان کیلئے۔

یہاں "یادداشت" سے مراد قرآن مجید ہے جو اہم سابقہ کے شرائع و احوال کا محافظ انبیائے

سابقین کے علوم کا جامع اور احکام الہی اور فلاح دارین کے طریقوں کو یاد دلانے والا ہے۔ اس
 آیت کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے۔ حضور! آپ کا کام یہ ہے کہ تمام انسانوں کے لئے اس کتاب
 کے مضامین خوب کھول کھول کر بیان فرمائیں جو چیز قابل تشریح ہے اس کی تشریح فرمادیں جو

مجل ہے اس تفصیل کو دیں۔ یہ آیت اس حقیقت پر دلیل قاطع ہے کہ آیات قرآنی کا وہی مطلب قابل اعتبار ہے جو حضور کی بیان فرمودہ حدیثوں کے مطابق ہو۔

ان آیات میں ان کے سوا ایک اور آیت ہے۔

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ
وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا
جو چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو دیں اس کو
لے لو اور جس سے روکیں اس سے رک جاؤ۔

اس آیت میں دو باتیں لائق توجہ ہیں۔ اول یہ کہ اس میں ما فرمایا گیا ہے جو عام ہونے کے اعتبار سے ہر اس چیز کو شامل ہے جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم تم کو دیں خواہ وہ قرآن مجید ہو یا ارشادات نبوی۔ ہمارا فرض ہے کہ اس کو قبول کر لیں اور پھر جس چیز سے آپ روکیں اس سے رک جائیں۔

ایتار اور نہی کی اسناد مجازی ہے یا حقیقی
دوسری بات یہ ہے کہ "اتی" اور "نھی" ان دونوں فعلوں کی اسناد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہو رہی ہے۔ اب گفتگو یہ ہو سکتی ہے کہ اسناد حقیقی ہے یا مجازی؟ اسناد مجازی کی صورت یہ ہوگی کہ دراصل "ایتاء" اور "نھی" کا فاعل یا فاعل ہوا۔

۱۵ اس آیت کی وجہ سے بعض صحابہ تو فرمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی کتاب اللہ کا اطلاق مجازاً کر دیتے تھے۔ بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے ہاتھوں کے گودنے اور گدوانے والی اور بالوں کو نوچنے والی اور حن کو نمایاں کرنے والی اور قدرتی پیدائش کی وضع کو بدلنے والی عورتوں پر لعنت بھیجی۔ ایک عورت ام یعقوب کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ آئی اور کہنے لگی "مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ آپ نے اس اس طرح لعنت بھیجی ہے۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا "میں کیوں اس شخص پر لعنت نہ بھیجوں جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملعون کیا ہوا اور پھر وہ کتاب اللہ میں بھی ہو" عورت کہنے لگی "میں نے پورا قرآن پڑھا ہے لیکن مجھ کو تو کہیں پر لعنت کا حکم ملا نہیں۔ آپ نے فرمایا "اگر تم نے قرآن پڑھا ہوتا تو یہ ارشاد ضرور مل جاتا۔ کیا تم نے آیت و مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا" پڑھی ہے امام یعقوب بن یونس نے یہ آیت تو پڑھی ہے۔ ابن مسعود نے فرمایا "تو پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کی نمود و نمائش اور زیبائش و آرائش سے منع فرمایا ہے (بخاری کتاب التفسیر سورۃ العنکبوت)۔"

تو ہے خداوند تعالیٰ کی طرف لیکن مجاز عقلی کے متعدد علاقوں میں سے کسی ایک علاقہ کے متحقق ہونے کی وجہ سے فعل کی اسناد بجائے اللہ کے رسول کی طرف کر دی گئی ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ یہاں اسناد حقیقی ہے اور اسناد مجازی ماننے کے لئے کوئی قوی وجہ موجود نہیں ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ اس قسم کے موقع پر اگر کوئی بات بڑھا چڑھا کر پر عظمت طریقہ سے بیان کرنی منظور ہوتی ہے تو وہاں اسناد مجازی سے کام لیا جاتا ہے مثلاً آپ اگر جامع مسجد دہلی کی عظمت بیان کرنا چاہتے ہیں تو کہیں گے "یہ مسجد شاہ جہاں بادشاہ نے بتائی ہے" پس اگر آیت بالا میں واقعی ابتداء اور بھی کا فاعل اللہ تعالیٰ ہوتا تو اس سے عدول کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی بلکہ حکم کی عظمت اور اس کے قبول کرنے کو بتا کید بیان کرنے کا مقتضی یہ تھا کہ بجائے رسول کے اللہ کو ہی فاعل بنایا جاتا۔ کیونکہ اللہ کا حکم "بہر حال" رسول کے حکم سے زیادہ عظمت رکھتا ہے لیکن ایسا نہیں کیا گیا بلکہ رسول اللہ کو دونوں فعلوں کا فاعل بنایا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ درحقیقت اتنی اور بھی کی اسناد اسناد حقیقی ہے مجازی نہیں۔ اس بنا پر اب آیت کے صاف معنی یہ ہو گئے کہ رسول اللہ بذات خود جو چیز تم کو دیں اس کو قبول کرو اور جس سے روکیں اس سے رک جاؤ۔

۱۰ حضرت ابو رافع کی ایک روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں تم میں سے کسی کو نہ پاؤں جو اپنے تخت پر تکیہ لگائے بیٹھا ہو اور جب اس کے پاس کوئی ایسا حکم آئے جس میں میں نے کسی کام کے کرنے کا امر یا نہ کرنے کی نہی کی ہو تو وہ کہے کہ میں اسے نہیں جانتا میں تو وہی جانتا ہوں جس کو کتاب اللہ نے بیان کیا" (ابوداؤد) جامع ترمذی میں مقدم بن معدی کرب کی حدیث ہے کہ کوئی شخص یہ نہ کہے کہ میں تو صرف کتاب اللہ کے حلال و حرام کو ہی مانتا ہوں۔ خبر دار ہو کہ جس کو رسول اللہ نے حرام کیا ہے وہ اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کی طرح ہے۔ ان روایات میں حمار اہلی (گدھے) درندوں اور نقطہ معاہدہ کی حرمت کا ذکر ہے جسے ہم آگے تفصیل سے بیان کریں گے۔ انہی احادیث کے بعض طریقوں میں یہ الفاظ بھی ہیں الا من بلغہ عنی حدیث فکذب بہ فقد کذب اللہ ورسولہ والذی حدیثہ یعنی اچھی طرح سن لو کہ جس کے پاس میری حدیث پہنچے اور اس کے باوجود اسے جھٹلائے تو حقیقت میں اس نے اللہ تعالیٰ کو، اللہ تعالیٰ کے رسول کو اور اس کو جھٹلایا جس نے اس سے یہ حدیث بیان کی (مجمع الزوائد للبیہقی)

خلاصہ یہ ہے کہ یہ اور اسی طرح کی متعدد آیات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کے احکام کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی اطاعت ضروری ہے۔ اب بحث یہ ہے کہ قرآن مجید کی یہ آیات قطعی الثبوت اور قطعی الحکم ہیں یا نہیں؟ اگر ہیں تو ان کا خارج میں کوئی مصداق موجود ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو وہ کیا ہے؟ اور کیا وہ سنت کے علاوہ کوئی اور چیز بھی ہے؟

یہاں تک جو گفتگو تھی وہ قرآن مجید کی ان چند آیات کے پیش نظر تھی جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع اور آپ کے ارشادات گرامی پر عمل پیرا ہونے کا حکم تھا۔ اب آئیے یہ دیکھیں کہ قرآن مجید حقیقی طور پر "سنت" کے بغیر سمجھ میں آ سکتا ہے یا نہیں اور اس کا صحیح مفہوم و مطلب بغیر سنت کے متعین ہو سکتا ہے یا نہیں؟

آیات قرآنی کا صحیح مفہوم اصل یہ ہے کہ اگر قرآن کو سمجھنے کی کوشش میں سنت سے کوئی سروکار نہ رکھا جائے تو قرآن مبہم اور امر و نواہی اور قصص کا ایک مجموعہ ہو کر رہ جائے گا۔ اور اسلام کے مکمل و مفصل دستور اساسی ہونے کی حیثیت بڑی حد تک باطل ہو جائیگی۔ مثلاً "اقیموا الصلوٰۃ" کے معنی و مصداق کی تحقیق میں اگر سنت سے مدد نہ لی جائے تو اس حکم کی تعمیل میں عجیب قسم کا انتشار نظر آئے گا۔ صلوٰۃ کے لغوی معنی دعا یا عبادت گاہ ہیں۔ پس کوئی صاحب تو اس حکم کی تعمیل محض عمارت کریں گے اور اس کے لئے بھی کوئی خاص شکل اور کوئی خاص وقت نہیں ہوگا و اگر عوامع الراکعین کے امر کی تعمیل میں بھی اسی طرح ہڑبونگ نظر آئے گی۔ رکوع کے معنی لغتاً مطلق انحصار (جھکنا) ہیں۔ اب اگر رکوع کو اس کی حقیقت شرعیہ (جس کا ثبوت صرف سنت سے ملتا ہے) سے الگ کر لیا جائے تو یہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ وارکعوا مع الراکعین کے معنی کیا ہیں؟ اور اس کا مقصد کیا ہے۔ ایک صلوٰۃ و رکوع پر کیا موقوف ہے، زکوٰۃ، حج، اوقات و ارکان صلوٰۃ، ربلو وغیرہ کسی کی صحیح حقیقت سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ اور پورے قرآن کو پڑھنے کے بعد بھی عبادات و معاملات کا کوئی مکمل جماعتی نقشہ مرتب نہیں ہو سکتا۔

حضرت عمران بن | امام بیہقی نے اپنی سند سے شیب بن فضالہ المکی سے بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ
حصین کا استدلال | عمران بن حصین نے چند لوگوں کے سامنے شفاعت کا بیان کیا ایک شخص

بولاً "اے ابوجنید تم ہمارے سامنے وہ حدیثیں بیان کرتے ہو جن کی اصل ہم کو قرآن میں نہیں ملتی"
عمران یہ سن کر غضبناک ہو گئے اور آپ نے اس شخص سے فرمایا "تم نے قرآن پڑھا ہے؟" اس نے
کہا "ہاں" فرمایا "کیا تم نے قرآن میں کہیں یہ پڑھا ہے کہ عشار کی فرض رکعتیں چار مغرب کی
تین، فجر کی دو، ظہر اور عصر کی چار چار ہیں" بولا "نہیں" حضرت عمران بن حصین نے فرمایا "کیا ان
سب رکعتوں کا علم تم نے ہم سے حاصل نہیں کیا۔ اور کیا ہم نے ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
سے نہیں سیکھا ہے" پھر عمران بن حصین نے سوال کیا "کیا تمہیں قرآن میں کوئی ایسی آیت ملی
ہے جس میں بتایا گیا ہو کہ چالیس بکریوں میں ایک بکری زکوٰۃ کی، اور اتنے اونٹوں میں ایک اونٹ
اور اتنے درہم میں ایک درہم زکوٰۃ کا ادا کرنا ہوگا" اس شخص نے کہا "نہیں" آپ بولے "کیا زکوٰۃ کی
ان تمام مقادیر اور نصاب کا علم تم نے ہم سے اور ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں
سیکھا ہے" اس کے بعد عمران نے فرمایا "قرآن مجید میں ہے ولیطوفوا بالبيت العتيق
تو کیا قرآن نے تم کو یہ بھی بتایا ہے کہ سات طواف کیا کرو اور اس سے فارغ ہو کر مقام ابراہیم
کے پیچھے دو رکعت ادا کرو" پھر فرمایا کہ تم نے قرآن میں یہ بھی دیکھا ہے؟

لا جلب ولا جنب، لا شغارفی الاسلام (مشکوٰۃ شریف) اسلام میں نہ جلب نہ جنب اور نہ شغارف

کیا تم نے سنا نہیں قرآن ہی خود کہتا ہے وما اتکم الرسول فخذوه وما نهکم عنہ
فانتھوا۔ اس تقریر کے بعد عمران بولے یہ اسلامی احکام (جو عبادات و معاملات سے متعلق ہیں)
سب کے سب ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لئے ہیں اور یہ وہ چیزیں ہیں جن کا تم کو علم نہیں

۱۔ زکوٰۃ کی اصطلاح میں جلب اور جنب یہ ہے کہ زکوٰۃ وصول کرنے والا زکوٰۃ کے مویشیوں سے دور خیمے گاڑ کر زکوٰۃ دینے
والوں کو اپنے پاس مویشیوں اور زکوٰۃ کی رقم کے لئے مجبور کرے اور شغارف کے معنی ہیں اپنی بیٹی کا دوسرے کے بیٹے سے اس شرط
پر نکاح کرنا کہ وہ اپنی بیٹی اس کے بیٹے سے بیاہ دے۔ اسلام میں دونوں باتوں کی ممانعت ہے۔

علیہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو فرمایا "جو تمیم وضو کا قائم مقام ہے وہی غسل کا بھی قائم مقام ہے" اس طرح کی بہت سی آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کا صحیح مفہوم متعین نہ فرمادیتے تو صحابہ کرام میں سخت اختلاف پیدا ہو جاتا اور قطعی طور پر ان کے متعلق کوئی فیصلہ نہ ہو سکتا۔

بعض دفعہ کلام کی مراد بجز مخاطب کے پھر حقیقت بھی نظر انداز نہ کرنی چاہئے کہ بعض اوقات کسی کلام کا کوئی دوسرا متعین نہیں کر سکتا صحیح مفہوم صرف مخاطب کے ذریعہ ہی متعین ہو سکتا ہے، مثلاً

فرض کیجئے آپ اپنے کسی بیمار دوست کی عیادت کے لئے گئے ہیں اور اس سے مزاج کی کیفیت دریافت کرتے ہیں تو وہ اکتائے ہوئے لہجہ سے کہتا ہے "اچھا ہوں" اس جملہ کا مطلب بظاہر یہی ہے کہ اب وہ تندرست ہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ بیمار دوست نے جو "اچھا ہوں" کہا تھا وہ کس لہجہ کے ساتھ کہا تھا اور اس بنا پر اس کا مطلب وہ نہیں ہے جو اس کے الفاظ سے ظاہری طور پر پرتبار ہوتا ہے بلکہ دراصل مقصد یہ ہے کہ بیماری کو اتنا امتداد ہو گیا ہے کہ اب میں اپنے مرض کے متعلق کیا کہوں؟ بس یہی کہنا چاہئے کہ اچھا ہوں۔

پس جب آپ روزمرہ کی گفتگو میں بعض جملوں کا مطلب ان کے ظاہر المعنی ہونے کے باوجود مخاطب کی امداد کے بغیر نہیں سمجھ سکتے تو قرآن مجید کو سنت سے الگ کر کے کس طرح سمجھ سکتے ہیں جبکہ یہ معلوم ہے کہ قرآن مجید تشریح احکام کی کتاب سماوی ہے اور اس کا نزول ایک خاص ماحول میں وقت کے پیش آمدہ مسائل کے جواب میں ایک خاص قسم کی نفسیات طبائع رکھنے والی قوم کی زبان میں انجام نجا ہوا ہے اور جس میں اخلاق و کردار کی اصلاح کے نفسیاتی اصول کو ہمیں نظر انداز نہیں کیا گیا۔

ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک روایت نقل کی ہے جس میں آپ فرماتے ہیں "کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں نہ ہو، لیکن بات یہ ہے کہ ہماری سمجھ اس کے فہم سے قاصر ہے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو

خطاب کر کے فرماتا ہے:-

لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ
إِلَيْهِمْ - (النحل) کے سامنے ان کی تشریح کر دیں۔

امام شافعی فرماتے ہیں "سنت ثابتہ قرآن کے منافی نہیں بلکہ اس کی موید ہے اگرچہ قرآن میں سنت کے الفاظ کی نص صریح نہ ہو کیونکہ کوئی شخص قرآن کو ایسا نہیں سمجھ سکتا جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سمجھا ہے۔
حضرت مکحول دمشقی فرماتے تھے:-

القرآن احوج الى السنة من
السنة الى القرآن. ۱۷
یحییٰ بن ابی کثیر کہتے تھے:-

السنة قاضية على الكتاب و
ليس الكتاب قاضيا على السنة
سنت کتاب اللہ پر حکم کرنے والی ہے اور کتاب
سنت پر حکم نہیں کرتی

ایک غلط فہمی کا ازالہ | اس سے اس غلط فہمی میں نہ رہنا چاہئے کہ سنت قرآن کے تابع نہیں اور قرآن سنت کے تابع ہے۔ اس قول کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کی حیثیت متن کی اور سنت کی حیثیت شرح کی ہے۔ قرآن میں خفی بھی ہے، مشکل اور محمل بھی، سنت ان سب کا بیان کرتی ہے اور ان کی تفصیل کرتی ہے۔ اس بنا پر سنت سے جو کچھ سمجھ میں آتا ہے اس سے فہم قرآن میں مدد لی جاسکتی ہے اور سنت چونکہ شرح کی حیثیت رکھتی ہے اور اس میں خفا، اجمال اور اشکال نہیں ہے اس لئے قرآن مجید کو اس کے لئے اصل تو کہا جائے گا مبتین نہیں

۱۷ حافظ ابو عمر بن عبد البر فرماتے ہیں۔ مکحول کا مطلب ان الفاظ سے یہ ہے کہ کتاب اللہ کیلئے سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبتین ہے یعنی اس کی مراد واضح کرتی ہے اٹھا تقضی علیہ وتبین المراد مند۔ (جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۹۱)
۱۸ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں "السنة قاضية على الكتاب" کی جگہ یوں تعبیر ہوئی چاہئے ان السنة تفسر الكتاب وتبينه (جامع بیان العلم ج ۲)

کہا جاسکتا۔ چنانچہ جن لوگوں نے سنت سے قطع نظر کر کے عبادات کے اوقات اور ارکان، اور ان کے طریقے خود قرآن سے اخذ کرنے کی کوشش کی ہے انہوں نے عجیب طرح کی مضحکہ انگیز تاویلوں سے کام لیا ہے۔ اور پھر بھی وہ عبادات کو اس منظم طریقہ پر قائم نہیں رکھ سکے جس پر اب تک امتِ محمدیہ کا عمل متواتر رہا ہے۔ اور اگر ان کی توجیہ و تاویل تعادلِ امت کے مطابق ہوتی بھی ہے تو وہ اس قدر کمزور ہوتی ہے کہ سب کا اس پر متفق ہونا مشکل ہے۔ یہاں ہم صرف اس کی ایک مثال پر کفایت کریں گے۔

قرآن مجید میں "اذنودی للصلوة من یوم الجمعة فاسعوا الی ذکر اللہ" فرمایا کہ اس کا حکم دیا گیا ہے کہ جمعہ کے دن نماز کی اذان ہو تو اشرب کے ذکر کے لئے دوڑو، اب اگر آپ سنت سے بالکل قطع نظر کریں تو محض اس آیت کو دیکھ کر یہ نہیں بتا سکتے کہ یہ حکم جمعہ کے دن کی کس نماز کے لئے ہے اور اگر جمعہ کی الگ کوئی نماز ہوتی ہے تو وہ کس وقت پڑھی جاتی ہے۔ ایک منکر حدیث کے سامنے اس کا ذکر آیا تو اس نے کہا کہ سنت سے استمداد کی ضرورت نہیں ہے وذر البیع تم بیع چھوڑ دو اور ابتغوا من فضل اللہ یہ دونوں ٹکڑے اس بات کی دلیل ہیں کہ جمعہ کی نماز ظہر کے وقت ہوتی ہے کیونکہ بیع و شرار اور ابتغوا من فضل اللہ یعنی رزق کے طلب کرنے کا وقت دوپہر کا ہی ہوتا ہے۔

اب غور کیجئے یہ توجیہ کس قدر کمزور ہے، آپ تصور کیجئے اگر آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اور مسلمانوں کا تعادل معلوم نہ ہوتا تو کیا اس وقت بھی محض وذر البیع اور ابتغوا من فضل اللہ کو سامنے رکھ کر جمعہ کی نماز کا وقت قطعیت کے ساتھ متعین کر سکتے تھے اور کیا آپ کو یہ خیال نہ آتا کہ دوپہر کو لوگ عموماً آرام کرتے ہیں خرید و فروخت کا اور طلب رزق کا وقت صبح اور شام ہی ہے جیسا کہ بالعموم ہندوستان میں دیکھا جاتا ہے۔

یہاں ہم نے صرف ایک مثال نقل کی ہے، سنت سے الگ رہ کر قرآن مجید سے آپ عبادات وغیرہ کی جو شکلیں، ارکان و آداب اور اوقات و شرائط مستنبط کریں گے، ان سب کا

حال ہی ہوگا۔ اور آپ مسلمانوں کو کسی ایک قطعی نظام کے ساتھ وابستہ نہیں کر سکیں گے جس کے باعث ان میں گمراہی پھیلے گی تشتت اور افتراق پیدا ہوگا اور ان کا شیرازہ جمعیت پریشان ہو کر رہ جائیگا۔ اسی قسم کی گمراہیاں ہیں جن سے محفوظ رکھنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

انی قد ترکت فیکم شیئین لن
میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں جن کے بعد

تضلوا بعد ہما ابدًا کتاب اللہ
تم کبھی بھی گمراہ نہیں ہو گے۔ ایک کتاب اللہ اور دوسری

وسنتی ولن یفتراقا حتی یردوا
میری سنت اور یہ دونوں حوض کوثر پر وارد ہونے

علی الحوض۔ ۱۰
تک ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔

مالک بن انس سے منقول ہے کہ سید کوئین نے حجۃ الوداع میں فرمایا۔

امران ترکتہما فیکم بن تضلوا
دو امر ہیں جن کو میں تم میں چھوڑے جاتا ہوں جب تک

ما تمسکتہما کتاب اللہ و
تم ان سے تمسک کرو گے گمراہ نہیں ہو گے، ایک

سنت نبیہ۔
کتاب اللہ اور دوسری سنت نبی۔

صحابہ کرام اور سنت کا احترام | یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام بعض اوقات کسی مسئلہ کی نسبت کوئی حکم

صادر فرمادیتے لیکن انہیں بعد میں معلوم ہوتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فتویٰ اس کے خلاف

ہے تو فوراً اس سے رجوع کر لیتے تھے۔ ایک مرتبہ بنو تقیف کے ایک شخص نے حضرت عمرؓ سے

دریافت کیا کہ بیت اللہ کی زیارت کرنے کے بعد اگر کسی عورت کو حیض آجائے تو وہ کوچ کرے

یا نہیں۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ اس پر ثقفی بولا کہ اس قسم کی ایک عورت سے متعلق آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم نے مجھ کو آپ کے فتوے کے خلاف فتویٰ دیا تھا۔ یہ سنت ہی حضرت عمرؓ کھڑے ہو گئے

اور ثقفی کو ڈرہ سے مار کر فرمایا "جس چیز کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فتویٰ دے چکے ہیں

تم اس کے متعلق مجھ سے کیوں دریافت کرتے ہو" حضرت عمرؓ دریافت فرماتے تھے کہ "دیت

عاقلہ کے لئے ہے اور کسی عورت کو شوہر کی دیت میں سے وراثت نہیں مل سکتی بضحاک بن سفیانؓ

۱۰ مستدرک حاکم عن ابی ہریرۃ کتاب العلم ج ۳ ص ۹۳۔

نے انھیں بتایا کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو لکھا تھا کہ اشم الضبی کی بیوی کو اس کی دیت میں سے حصہ دیدیا جائے حضرت عمرؓ نے یہ سن کر اپنے قول سے رجوع کر لیا۔ ۱۵
 اسی طرح جنین (حمل) کی دیت کے بارہ میں حضرت عمرؓ کا قیاس یہ تھا کہ عام دیتوں کی طرح اس میں بھی گائے بکری وغیرہ دینی ہوگی لیکن جبکہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے آپ کو معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلہ میں ایک غلام یا باندی کے آزاد کرنے کا حکم دیا ہے تو آپ نے حضرت مغیرہ سے ان کی روایت پر ایک شاہد طلب کیا اور جب محمد بن مسلمہ نے شہادت دیکر اس کی توثیق کر دی تو حضرت عمرؓ کو اطمینان ہو گیا اور پھر آپ نے اس حدیث کی روایت میں ہی دیت جنین کے متعلق فیصلہ کیا۔ ۱۶

بعض روایتوں میں تو یہاں تک آتا ہے کہ اسی قسم کے ایک معاملہ میں حضرت عمرؓ نے ایک صحابی کی زبانی حدیث سن کر ارشاد فرمایا "اگر ہم یہ روایت نہ سنتے تو قریب تھا کہ اپنی رائے سے کام لیکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے خلاف کوئی حکم صادر کر بیٹھتے۔"
 صحابہ اگر کسی چیز پر عامل ہوتے اور ان کو معلوم ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول یا فعل اس کے خلاف ہے تو فوراً اس سے تائب ہو جاتے تھے۔ حضرت عمرؓ ایک مرتبہ شام تشریف لے جا رہے تھے۔ مقام سرغ پر پہنچ کر انھیں معلوم ہوا کہ وہاں وبا پھیلی ہوئی ہے۔ اب آپ بڑے متروک ہوئے، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "اگر کسی شہر میں وبا پھیلی ہوئی ہو تو وہاں مت جاؤ اور اگر تم کسی شہر میں موجود ہو اور وہاں وبا پھیلنی شروع ہو جائے تو اس کے خوف سے بھاگو مت۔" حضرت عمرؓ یہ سن کر سرغ سے واپس تشریف لے آئے۔

کسی مسئلہ میں اگر انھیں شک ہوتا تھا تو خود اقدام نہیں کرتے تھے پہلے اس کا حکم کتاب اللہ میں تلاش کرتے اگر وہاں نہ ملتا تو سنت میں تلاش کرتے تھے۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ کے پاس ایک عورت آئی جس کے نواسہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے حق وراثت کا مطالبہ کیا۔ آپ نے فرمایا "تمہارے لئے قرآن میں کوئی حکم نہیں ہے اور جہاں تک مجھ کو معلوم ہے سنت میں بھی کچھ نہیں ہے، اب تم چلی جاؤ، میں لوگوں سے دریافت کر لوں۔ آپ نے صحابہ کرام سے استفسار کیا تو حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے فرمایا "میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھا۔ آپ نے اسی طرح کے ایک معاملہ میں نانی کو چھٹا حصہ دلوا دیا تھا۔" حضرت ابو بکرؓ نے پوچھا "تمہارا کوئی گواہ بھی ہے؟" محمد بن مسلمۃ الانصاریؓ کھڑے ہو کر بولے "میں ہوں" اور انھوں نے وہی فرمایا جو حضرت مغیرہ نے کہا تھا۔ یہ سن کر آپ نے عورت کو سوس دینے کا حکم صادر کر دیا۔

ابن خزمیہ کہتے تھے "اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث ثابت ہو جائے تو اس کے ہوتے ہوئے کسی اور کو کچھ کہنا درست نہیں ہے۔"

جو لوگ حدیث کو بھی نہیں مانتے وہ ائمہ دین کے ان اقوال کو کیا مانیں گے۔ لیکن ہم نے ان کو اس غرض سے نقل کیا ہے کہ ان اقوال سے سنت کی اصل حیثیت پر روشنی پڑتی ہے ہم نے بجائے اس کے کہ سنت اور قرآن کے باہمی تعلق پر بحث کے لئے اپنے دلائل کے سلسلہ میں یہ چیزیں بیان کرتے، ان بزرگوں کے حوالہ سے انھیں بیان کر دیا ہے۔

صحابہ کرام جو زبان دان ہونے کے باوصف در سگاہ نبوت سے براہ راست فیضیاب ہونے کا شرف رکھتے تھے اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے تھے کہ قرآن مجید کی بہت سی آیتیں مجمل ہیں، کہیں ان آیتوں میں ظاہری اعتبار سے اشکال اور خفا پیدا ہو گیا ہے، اگر اس اجمال و خفا کو دور کرنے کے لئے سنت سے کام نہ لیا جائے تو ظاہر ہے کسی مکمل ضابطہ احکام اور مجموعہ قوانین کی ترتیب دشوار ہو جائے مثلاً قرآن مجید میں ہے اقموا الصلوة منازر پڑھو۔

۱۔ ابو داؤد کتاب القرائن باب فی المجدۃ - ۲۔ یہ سب اقوال و روایات مفتاح الجنۃ: جامع بیان العلم جلد ثانی ابن عبد البر اور مفتاح السنۃ للبخاری سے ماخوذ ہیں۔

اقوال الزکوٰۃ زکوٰۃ اذاکرو السارق والساqrۃ فاقطعوا ايديهما۔ احل الله البيع وحرم الربوا۔
 اللہ نے تمہارے لئے خرید و فروخت حلال کر دی اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔ لیکن تمام قرآن میں
 یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ نماز کس طرح پڑھیں اور اس کے ارکان کیا ہیں اور ان میں کیا ترتیب ہے؟
 زکوٰۃ کس کس مال پر واجب ہے اور کتنی، چور کا ہاتھ کاٹنے کے لئے کوئی نصاب مقرر ہے یا نہیں؟
 اگر نہیں ہے تو اس میں بڑا اختلاف لازم آتا ہے۔ کسی نے ایک پیسہ چرایا اور اس کو دست بریدہ کر دیا
 گیا۔ اور اگر نصاب مقرر ہے تو وہ کتنا؟ پھر ایک چوری میں دونوں ہاتھ بیک وقت قطع کئے جائیں گے
 یا ایک ہی ہاتھ کاٹا جائے گا اور اگر ایک ہی ہاتھ قطع ہوگا تو دایاں یا بائیں۔ اسی طرح قرآن
 نے بیع کو حلال اور ربوا کو حرام تو بتا دیا لیکن لغت میں ربوا کے معنی صرف زیادتی کے ہیں یہ نہیں
 بتایا گیا کہ اس زیادتی سے کیا مراد ہے؟ اور کس قسم کی اور کتنی زیادتی حرام ہے۔

اگر صرف قرآن پر ہی بایں معنی مدار شریعت ہے کہ احادیث کی بیان کی ہوئی تشریحات
 کو یک قلم نظر انداز کر دیا جائے اور الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی فرما کر
 جس دین کے اکمال کا مشورہ سنایا گیا ہے اگر اس کا منبع و مصدر صرف وہ قرآن ہے جس کے معانی
 و مطالب کی تفہیم میں صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو کوئی دخل نہ ہو تو ان تمام
 تنقیحات بالا کا جواب اس میں ہونا چاہئے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس میں نہیں ہے ہاں سنت
 کو قرآن کے لئے بیان و تفسیر یا تفصیل اجمال قرار دیا جائے اور دونوں کو ملا کر تشریح احکام
 کا نشانہ کہا جائے تو بے شبہ قرآن مجید کا دعویٰ اتمام نعمت و اکمال دین درست ہے اور
 خود قرآن مجید کی تصریحات سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ سنت اس کے لئے بمنزلہ بیان و تشریح
 ہے۔ آیت ذیل پر پھر غور کیجئے۔

عے حافظ ابن عبد البر فرماتے ہیں۔ والبیان منه صلی اللہ علیہ وسلم علی ضربین بیان المحمل فی الكتاب العزیز
 كالصلوات الخمس فی مواقیبها وسجودها و رکوعها و سائر احکامها و کبیانہ للزکوٰۃ و وحدها و وقتها و ما الذی
 توخذ منه الاموال و بیانہ لمناسک الحج قال صلی اللہ علیہ وسلم اذ یحج بالناس خذ و غنی مناسککم لان
 القرآن انما ورنہ بجملة فرض الصلوة و الزکوٰۃ و الحج دون تفصیل و الحدیث مفصل جامع بیان العلم و فضلہ ج ۲
 ص ۱۹۰

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ
لِلنَّاسِ مَا نَزَّلَ إِلَيْهِمْ
ہم نے آپ پر نصیحت کی کتاب نازل کی تاکہ جو تعلیم لوگوں کی
طرف بھیجی گئی ہے آپ ان پر اچھی طرح واضح کر دیں۔

دیکھئے لِسُبَّانِ میں لام غایت کا ہے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
پر جو قرآن نازل کیا ہے اس کی غایت یہی ہے کہ آپ اس کو کھول کھول کر لوگوں کے سامنے بیان
کریں یعنی آپ ہی اس کے بہترین شارح، مفسر اور اس کے معانی و مطالب کو بیان کرنے والے ہیں۔
کوئی شخص فہم قرآن میں آپ سے اور آپ کی بیان فرمودہ تشریحات سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔

مطرف بن عبد اللہ سے کسی نے کہا تم ہم سے سوائے قرآن کے اور کچھ بیان نہ کیا کرو فرمایا
”بجز ہم قرآن کے بدلہ کسی اور چیز کو تمہارے سامنے پیش نہیں کرتے البتہ احادیث سنا کر اس
ذاتِ گرامی کا ارادہ کرتے ہیں جو ہم سب سے زیادہ عالم بالقرآن تھے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
ایسا ہی ایک واقعہ حضرت سعید بن جبیرؓ کے ساتھ پیش آیا۔ ایک مرتبہ انھوں نے ایک حدیث
بیان کی۔ ایک شخص بولا ”قرآن مجید میں تو اس کے خلاف ہے“ سعید بن جبیرؓ نے فرمایا

”میں ایک حدیث بیان کرتا ہوں اور تم اس پر کتاب اللہ پیش کرتے ہو۔ آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم تمہاری پندت کتاب اللہ کو زیادہ اچھی طرح جانتے تھے“ ۳۵

قرآن کے اجمال اور سنت کی حیثیت تفصیل و بیان کی بنا پر صحابہ کرام سنت کے ساتھ
بہت اعتنا کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اسی کے ذریعہ قرآن کی آیات کے صحیح معانی و مطالب
متعین ہو سکتے ہیں۔ حضرت عمر بن الخطابؓ فرماتے تھے۔

”عنقریب تمہارے پاس ایسے لوگ آئیں گے جو قرآن مجید کے شہات کے ساتھ تم کو مجاہدہ کریں گے

تم ان پر سنن کے ذریعہ گرفت کرنا کیونکہ اصحابِ سنن کتاب اللہ کے بڑے عالم ہوتے ہیں“ ۳۶

۱۔ جامع بیان العلم ج ۲ و موافقات امام شاطبی ج ۲ ص ۲۶۔ ۳۵ مسند دارمی۔

۳۵ موافقات امام شاطبی ج ۲ ص ۱۴۔ وعن ابن مسعودؓ ستجدون اقواما یدعونکم الی کتاب اللہ نبذوہ
وراء ظہورہم فعلیکم بالعلم وعن عمرؓ انما اخاف علیکم رجلین رجل یتاول القرآن علی غیر
تاویلہ ورجل ینافس (علیٰ اخیہ) (ایضا کتاب مذکورہ ان آثار کو نقل کرنے کے بعد) (باقی صفحہ ۹۳ پر ملاحظہ ہو)

بعینہ ہی مقولہ لالکائی نے حضرت علی بن ابی طالبؓ سے نقل کیا ہے۔

علامہ ابن سعدؒ نے "طبقات" میں بطریق عکرمہؒ حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے ان کو خوارج کے پاس بھیجا تو فرمایا "تم ان کے پاس جاؤ اور مباحثہ کرو، مگر دیکھنا قرآن کو درمیان میں نہ لانا کیونکہ وہ معانی مختلفہ کو محتمل ہوتا ہے۔ البتہ سنت سے احتجاج کرنا" ابن عباسؓ نے فرمایا "میں تو ان کی بہ نسبت قرآن کو زیادہ جانتا ہوں کیونکہ وہ ہمارے گھر میں ہی نازل ہوا ہے" حضرت علیؓ بولے "ہاں تم سچ کہتے ہو، لیکن القرآن حتمال ذو وجوہ قرآن میں (اجمال کی وجہ سے) مختلف معانی کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ تم بھی کہتے رہو گے اور وہ بھی کہتے رہیں گے، فیصلہ کچھ نہ ہوگا۔ اس لئے سنن سے استدلال کرنا، وہ اس سے بچ کر کہیں نہیں جاسکیں گے چنانچہ حضرت ابن عباسؓ نے خوارج سے سنت کی روشنی میں مناظرہ کیا تو وہ لاجواب ہو گئے۔

دین کا مدار قرآن و سنت دونوں پر ہے | جیسا کہ ہم ابھی ضمناً اشارہ کر چکے ہیں۔ دراصل دین الہی کا مکمل نقشہ قرآن و سنت کے امتزاج ہی سے سامنے آسکتا ہے۔ قرآن بطریق متن اور سنت

بہ طور تفسیر و تشریح ہے۔ اور تشریح احکام کا بنی دونوں ہیں۔ چنانچہ صحابہ کرام و تابعین عظام بھی یہی سمجھتے تھے۔ اور ان دونوں پر ہی دین کا مدار رکھتے تھے۔ میمون بن مہرانؓ سے ایک روایت ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے پاس کوئی خصومت لے کر آتا تھا تو آپ قرآن میں اس کے لئے حکم تلاش کرتے تھے اگر اس میں نہ ملتا تو سنت میں تلاش کرتے اور اگر اس میں بھی انھیں کوئی حکم دستیاب نہیں ہوتا تھا تو لوگوں کو جمع کر کے وہ مسئلہ پیش کرتے اور ان سے پوچھتے کہ آپ کو اس مسئلہ کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فیصلہ یاد ہے یا نہیں؟ وہ لوگ جواب اثبات میں دیتے تو آپ فرماتے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۲) علامہ شاطبی فرماتے ہیں۔ وھنا آثارانی ھذا المعنی حملھا العلماء علی تاویل القراءت بالرای مع طرح السنن یعنی اس مضمون کے اور بہت سے آثار ہیں جن کا محمل علماء سلف کے یہاں یہ ہے کہ آیات قرآنی کے معنی سنن کو پس پشت ڈال کر اپنی رائے سے بیان کرنا۔

الحمد لله الذي جعل فينا تمام اعرافين الله كمن فيهم من دين كى
من يحفظ علينا ديننا حفاظت كزواله پيدا كئے اور انھیں باقى ركھا۔

جابر بن زبير كہتے ہيں ايك مرتبہ طواف ميں حضرت ابن عمرؓ ملے فرمانے لگے "ابو الشعثار
تم فقہاء بصرہ ميں سے ہو، بجز قرآن ناطق اور سنت صحيحہ كے كسى اور چيرے فتوى نہ دينا۔ اگر تم نے
ان سے تجاوز كيا تو خود بى ہلاك ہو گے اور دوسروں كو بھى ہلاك كرو گے۔"

اسى طرح ابو سلمہ بصرہ ميں تشریف لائے اور حسن بصرىؒ ان سے ملنے آئے تو آپ نے
حضرت حسنؒ سے فرمايا "مجھ كو معلوم ہوا ہے كہ تم اپنى رائے سے فتوى ديتے ہو، خبردار كہيں ايسا نہ كرنا
جب تك تمہارے پاس مسئلہ مستفتى بہ سے متعلق كوئى سنت يا قرآنى آيت نہ ہو۔"

سعید بن المسیب نے ايك شخص كو ديكھا كہ دو ركعتوں كے بعد بھى كچھ اور ركعتیں پڑھ
رہا ہے اس شخص نے نماز سے فارغ ہو كر پوچھا "ابو محمد! كيا خدا مجھ كو اس نماز پر عذاب دے گا؟"
فرمايا "نماز پر نہیں بلکہ سنت كا خلاف كرنے پر" سعید بن جبیر فرماتے تھے "كوئى قول بغير عمل كے
اور كوئى قول و عمل بغير نيت كے مقبول نہیں ہونا اور قول و عمل اور نيت اس وقت تك مقبول
نہیں ہوتے جب تك وہ سنت كے موافق نہ ہوں" حضرت حسن بصرىؒ سے بھى اسى قسم كا
ايك مقولہ مروى ہے۔

بہر حال اس طرح كے سينكڑوں آثار ہيں جن سے ثابت ہوتا ہے كہ سلف صالحين نے
دين قيمہ كى ہدایتوں كا مركز قرآن و سنت دونوں كو ہى سمجھا اور اس بنا پر جس طرح انھوں نے
قرآن كى حفاظت اپنى جان فروشانہ قربانيوں سے كى اور اس كى حرمت كو برقرار ركھنے كے لئے
خون كے آخرى قطرہ سے بھى دریغ نہیں كيا۔ ٹھيك اسى طرح انھوں نے سنت رسول اللہ

سے مشہور و معروف عربى داں فاضل ڈاكٲر اسپرنگر نے الاصابہ فى معرفة الصحابہ كے ديباچہ ميں لكھا ہے "نہ كوئى
قوم دنيا ميں ايسى گذرى نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں كى طرح امار الربال سا عظيم الشان فن ايجاد كيا ہو
جس كى بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں كا حال معلوم ہو سكتا ہے۔"

صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حرز جان بنا کر رکھا اور اس کی حفاظت میں انسانی کوشش و سعی کا کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ حضرت ابوذر غفاری فرمایا کرتے تھے "اگر میری گردن پر تلوار رکھ دی جائے اور مجھ کو یہ معلوم ہو کہ قتل ہونے سے پہلے ایک کلمہ بھی جو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے لوگوں تک پہنچا سکتا ہوں تو میں اس امانت کو دوسروں تک ضرور پہنچا دوں گا۔"

حضرت ابوہریرہؓ نے رات کے تین حصے کر رکھے تھے، ایک میں سوتے تھے اور ایک حصہ عبادت و تلاوت قرآن میں بسر کرتے تھے اور ایک حصہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث یاد کرتے تھے۔ آج جبکہ بنا بنا یا مکمل دین آپ کے پاس ہے آپ کو انکارِ حدیث کی جسارت ہوتی ہے لیکن اس وقت کا تصور کیجئے جبکہ آپ کے پاس ایک حدیث بھی نہ ہوتی اور صرف قرآن مجید ہوتا تو کیا اس وقت بھی یہ دین برحق اپنی اس صورت میں آپ کو نظر آسکتا تھا؟

حدیث کی تشریحی حیثیت | یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ ہم نے حدیث کی تشریحی حیثیت کا اور اس سے غرض بار بار ذکر کیا ہے اور اس کو آیات بیانات سے ثابت کر چکے ہیں لیکن یہ

حقیقت فراموش نہ کرنی چاہئے کہ تشریح کے باب میں قرآن و حدیث دونوں ایک پلہ کے نہیں ہیں۔ قرآن قطعی الثبوت ہے اور حدیث ظنی پھر دونوں قوت و حکم کے اعتبار سے یکساں کس طرح ہو سکتے ہیں۔ اس بنا پر اگر کوئی حدیث قرآن مجید کے کسی قطعی حکم کے خلاف ہو تو اس کو قبول نہیں کیا جائے گا کیونکہ سند و الفاظ حدیث کے لحاظ سے اس میں متعدد احتمالات ہو سکتے ہیں۔ بعض لوگوں کو اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول اور وما اتکم الرسول فخذوا و ما نہیکم یہ شبہ ہو گیا ہے کہ قرآن کی طرح سنت بھی تشریح میں مستقل حیثیت رکھتی ہے یہ خیال درست نہیں کیونکہ قرآن مجید نے ہی خود اس کی بھی تصریح کی ہے کہ

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی خواہش سے کچھ نہیں فرماتے

إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ
بلکہ وہ نازل شدہ وحی ہوتی ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اصل وحی (قرآن) ہے اور نطق نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام

اس سے نکلی ہوئی فرع، اس بنا پر لامحالہ نطق گرامی وحی متلو کے مطابق ہوگا۔ بالفرض اگر دونوں میں مطابقت کی کوئی صورت نہ ہو تو حدیث کو ترک کرنا پڑے گا۔ لیکن اس حیثیت سے نہیں کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے بلکہ اس وجہ سے کہ قرآن کے ایک حکم ظاہر الدلالة سے متعارض ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اس قول کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف انتساب ہی نادرست ہے۔

پس سنت کی تشریح سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ قرآن کی طرح اس باب میں مستقل حیثیت رکھتی ہے بلکہ غرض صرف یہ ہے کہ سنت وحی الہی کے لئے بمنزلہ بیان اور تفصیل کے ہے اگر کسی صحیح الثبوت سنت سے کوئی ایسا حکم ملے جس کے متعلق قرآن میں سکوت ہو یا اس کے کسی ایک ہی پہلو کو بیان کیا گیا ہو، یا اس حکم کے بیان میں کسی قسم کا کوئی اشکال و خفا رہ گیا ہو تو قرآن و سنت دونوں کو ملا کر ایک حکم مفصل کا استنباط کیا جائے گا اور اس وقت قرآن کی حیثیت متن کی اور سنت کی حیثیت شرح کی ہوگی۔ اب ہم ذیل میں اس کی چند مثالیں لکھتے ہیں تاکہ تشریح بالسنت کی حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے۔

۱۔ قرآن میں صرف نماز کا حکم ہے لیکن رکعات کی تعداد نہیں بتائی گئی۔ سنت نے ان کو بیان کر دیا ہے۔ اگر کوئی شخص مغرب میں دو، فجر میں تین، ظہر، عصر اور عشاء میں پانچ پانچ یا دو دو اور تین تین رکعتیں پڑھے گا تو اس کی نماز بالکل نہیں ہوگی اور وہ نہ صرف سنت کا مخالف کہا جائیگا بلکہ قرآن کا بھی۔

۲۔ قرآن نے صرف اتنا بتایا ہے کہ نکاح حلال ہے اور زنا حرام، لیکن نکاح مشروع کے علاوہ نکاح غیر مشروع کون کون سے ہیں۔ قرآن میں ان کا تفصیلی ذکر موجود نہیں ہے۔ صحیح حدیث میں ہے۔

ایما امرأة نکحت بغیر اذن ولیہا جس عورت نے بغیر اجازت ولی کے نکاح کر لیا

فانکاحها باطل۔ لہ اس کا نکاح باطل ہے۔

یہاں اس سے بحث نہیں کہ عورت سے باکرہ تیبہ دونوں مراد ہیں یا ایک اور ولی کون ہے اور ولایت کا معنی خیار بلوغ پر ہے یا بکارت پر کہنا یہ ہے کہ آپ اس حدیث کو نظر انداز نہیں کر سکتے قرآن مجید نے نکاح کو اجمالاً بیان کیا ہے۔ احادیث صحیحہ میں نکاح کے جو شرائط صحت وغیرہ تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں ان کو قرآن کے ساتھ ملا کر ایک مکمل قانون نکاح تیار کرنا ہوگا۔

۳۔ قرآن میں صرف ربوا کی حرمت کا ذکر ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہوا کہ ربوا سے مراد کیا ہے؟ اور اس کی حرمت کا مدار کس چیز پر ہے؟ حدیث نے اس سوال کا جواب دیا ارشاد نبوی ہے

الذهب بالذهب الفضة بالفضة بیچو سونے کو سونے کے بدلہ میں چاندی کو چاندی کے

والبر بالبر والشعیر بالشعیر والتمر کیہوں کو گہوں کے، جو کو جو کے، کھجور کو کھجور کے

بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثل سواء اور نمک کو نمک کے بدلہ میں جنس جنس برابر برابر

بسواء یداً بیداً والفضل ربواً دست بدست اور زیادتی ربوا ہے۔

اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ قرآن مجید میں جو لفظ ربوا آیا ہے اس سے مراد کیا ہے یہ دوسری بات ہے کہ حدیث سے بھی پوری تفصیل اس لئے سمجھ میں نہیں آتی کہ اس میں حرمت ربوا کے منشا کی جزوی طور پر تعین نہیں کی گئی ہے وجہ ہے کہ ائمہ مجتہدین نے اپنے اپنے اجتہاد کی روشنی میں علت حرمت کی تشخیص فرمائی یعنی الفاظ حدیث میں اس کی تصریح نہیں کہ حرمت ربوا کا مدار جنسیت اور تفاضل دونوں پر ہے یا صرف ایک پر یا از قسم کیلالت و موزونات ہونے پر یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس سے تشریف لے گئے اور ہم پر ربوا کی حقیقت مکمل طور پر واضح نہیں ہوئی تاہم غور کیجئے اگر یہ حدیث نہ ہوتی تو کیا آپ محض الفاظ قرآنی سے ربوا کی حقیقت کسی درجہ میں بھی سمجھ سکتے؟ یقیناً نہیں۔ پس ربوا کے متعلق جو احکام وضع کئے جائیں گے ان کے لئے قرآن کو اصل اور حدیث کو اس کا بیان قرار دے کر کئے جائیں گے۔

۴۔ قرآن مجید میں دوہنوں کو نکاح میں بیک وقت جمع کرنے کو حرام قرار دیا گیا ہے

۱۵ صحیح مسلم و دیگر کتب صحاح (باب الربا)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ اس تحریم کی وجہ یہ ہے کہ:-

دو بہنوں کو نکاح میں جمع کر دینے سے قطع صلہ رحم لازم آجاتا ہے جو اللہ کے نزدیک انتہائی مبغوض اور قبیح چیز ہے اس کے علاوہ بھانجی اور خالہ، بھتیجی اور بھوپتی ان دونوں کو اگر نکاح میں جمع کیا جائے تو اس سے بھی قطع رحم لازم آتا ہے اس بنا پر آپ نے ان کو نکاح میں جمع کرنے کی حرمت کا بھی اعلان فرما دیا۔ آپ کے اس فرمان کو معاذ اللہ حکم قرآن کے خلاف نہیں کہا جاسکتا۔ بلکہ اس کی تعبیر یوں کی جائے گی کہ قرآن مجید نے جمع بین الاختین کا ذکر کر کے صرف حکم حرمت کی علت کی طرف اشارہ کر دیا۔ اس سے مقصد یہ نہیں ہے کہ حرمت جمع کا حکم صرف ایک ہی صورت تک محدود رکھا جائے اس لئے آپ کو بحیثیت شارع اسلام ہونے کے اس کا حق ہے ہے کہ قرآن کی اس اصل کی روشنی میں دو بہنوں کے علاوہ بھانجی اور خالہ، بھتیجی اور بھوپتی کو ایک نکاح میں جمع کرنے کی حرمت کا بھی اعلان فرمادیں۔

ان چند مثالوں سے یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ ہم حدیث کی تشریحی حیثیت سے کیا مراد لیتے ہیں یعنی جب ہم کسی چیز کے متعلق احکام وضع کرنا چاہتے ہیں تو قرآن مجید کو اصل قرار دے کر احادیث کا نتیجہ کرتے ہیں اور پھر دونوں کی تطبیق سے مسائل کا استنباط کرتے ہیں نہ یہ کہ سنت کو مستقل تشریحی حیثیت حاصل ہے اور قرآن مجید سے قطع نظر کر کے صرف سنت سے استخراج احکام کیا جاسکتا ہے علامہ ابواسحاق الشاطبی متوفی ۳۹۰ھ نے "الموافقات" کی جلد چہارم میں صفحہ ۱۳ سے صفحہ ۳۱ تک اس پر مفصل بحث کی ہے کہ سنت کو کتاب اللہ سے منطبق کرنے کی کتنی صورتیں ہیں اور اس ذیل میں مختلف مذاہب بیان کئے ہیں اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں:-

"سنت میں جو معانی اور احکام تفصیلیہ پائے جاتے ہیں وہ سب قرآن مجید میں موجود ہیں

لیکن وہ صرف ان ہی لوگوں کو معلوم ہو سکتے ہیں جو قرآن میں تفقہ تام رکھتے ہوں اور اس میں

تدبر کرتے ہوں اگرچہ وہی معانی اور احکام سنت میں زیادہ وضاحت اور تفصیل کے ساتھ

ملیں گے۔"

تذوینِ حدیث

گذشتہ بحث سے یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ قرآن مجید کے فہم میں حدیث سے مدد لینا ناگزیر ہے، اب ہم تذوین اور صحت حدیث پر ایک تاریخی نظر ڈال کر بتانا چاہتے ہیں کہ روایت اسناد اور درایت کے لحاظ سے حدیث کا مرتبہ کس قدر بلند ہے تاکہ منکرین حدیث کو اپنے دلائل پر غور کرنے کا موقع ملے۔

عہدِ نبوت اور | یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں حدیث
تذوین حدیث | لکھنے کا اتنا اہتمام نہیں کیا گیا جتنا کہ قرآن مجید کے لکھنے کا کیا گیا بلکہ بعض احادیث سے یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کتابت حدیث کی ممانعت کر رکھی تھی۔

حضرت ابوسعید الخدریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لا تکتبوا عنی ومن کتب عنی تم میری احادیث نہ لکھو اور جو شخص قرآن کے علاوہ

غیر القرآن فلیحد و حدوا میری حدیثیں لکھتا ہو اس کو چاہئے کہ انھیں مٹا دے

عنی فلا حرج ومن کذب ہاں میری حدیث بیان کرو اس میں کچھ حرج نہیں

علی متعمداً فلیتبو أمقعداً ہے اور جو شخص قصداً مجھ پر جھوٹ باندھے اس کو

من النار۔ (صحیح مسلم) اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنا لینا چاہئے

اسی کے ساتھ بعض روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بعض خاص خاص ارشادات

نبوی تھے جنہیں آپ نے خود قلمبند کرایا یا کسی نے انہیں خود قلمبند کرنا چاہا تو آپ نے اس

کی ممانعت نہیں فرمائی۔

حضرت ابوسہریرہؓ سے روایت ہے کہ خزاعہ کے آدمیوں نے فتح مکہ کے سال

بنولیت کے کئی ایک آدمی اپنے ایک مقتول کے بدلہ میں قتل کر دیئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ اپنی سواری پر سوار ہوئے اور حسب ذیل خطبہ ارشاد فرمایا۔

”اللہ نے مکہ میں قتل کرنے کی ممانعت کر دی ہے اور مکہ پر رسول اللہ اور مومنین مسلط کر دیئے گئے ہیں۔ یہ نہ مجھ سے قبل کسی کے لئے حلال تھا اور نہ میرے بعد کسی کے لئے حلال ہے۔ ہاں! یہ دن میں صرف ایک ساعت کے لئے حلال تھا لیکن اب اس وقت قتل و قتال حرام ہے نہ تو یہاں کا کانا کاٹا جاسکتا ہے اور نہ یہاں کے کسی درخت کو قطع کیا جاسکتا ہے اور نہ یہاں کوئی ٹہری ہوئی چیز اٹھائی جاسکتی ہے۔ صرف وہ اٹھا سکتا ہے جس کی چیز گم ہوگئی ہو اور وہ اسے ڈھونڈنے نکلا ہو۔ اور جس شخص کا کوئی آدمی قتل کر دیا گیا ہو اس کو اختیار ہے چاہے مقتول کے بدلہ میں دیت لے یا قصاص“

اتنے میں ایک مینی شخص آیا اور اس نے عرض کیا ”یا رسول اللہ میں لکھ لوں (یعنی آپ کا یہ خطبہ) آپ نے فرمایا ”ابو فلاں“ کے لئے لکھ دو۔“

محدثین نے ان دونوں روایتوں میں تطبیق اس طرح پیدا کی ہے کہ آپ نے جس زمانہ میں کتابت حدیث کی ممانعت فرمائی تھی وہ نزول وحی کا زمانہ تھا۔ اگر قرآن مجید کی طرح حدیث کی کتابت کا بھی اہتمام کیا جاتا تو اندیشہ تھا کہ دونوں میں التباس واقع ہو جائے۔ پھر جب التباس کا اندیشہ جاتا رہا تو آپ نے لکھنے کی اجازت دیدی۔ بہر حال یہ ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں آپ کے اقوال و افعال کو قلمبند کرنے کا عام اہتمام نہیں تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کی وفات کے بعد صحابہ کرام کے پاس بجز قرآن کے کوئی دوسرا صحیفہ نہیں تھا۔ کسی ضرورت کے وقت اگر وہ کوئی حدیث بیان بھی کرتے تھے تو اپنے حافظ سے بیان کرتے تھے۔

حافظ ذہبی نے حاکم سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔ جس میں پانچ سو احادیث تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک شب حضرت عائشہؓ نے انھیں دیکھا کہ کرب و اضطراب سے کروٹیں بدل رہے ہیں۔ انھیں اس سے رنج ہوا پوچھا آپ کو کوئی تکلیف ہے؟ صبح ہوئی تو فرمایا "بیٹی! احادیث کا جو مجموعہ تمہارے پاس ہے ذرا لانا" حضرت عائشہؓ نے اس کو پیش کیا۔ آپ نے آگ منگا کر اسے جلا ڈالا۔ وجہ پوچھی گئی تو فرمایا "میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں مرجاؤں اور یہ مجموعہ میرے پاس ہو۔ اور اس میں ایسے شخص کی احادیث بھی ہوں جس کو میں نے ثقہ سمجھا ہو اور وہ دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی نہ ہوں تو اس کی نقل کی ذمہ داری مجھ پر ہی ہوگی۔ لیکن یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ خود حافظ ذہبی اس کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں فہذا لا یصح یہ روایت صحیح نہیں ہے۔"

بعض خاص صحیفے | بخاری کی ایک روایت سے صرف حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ وہ حدیث کی کتابت کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ جو کثرتِ روایت میں مشہور تھے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بجز عبداللہ بن عمرؓ کے مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا وہ احادیث قلمبند کرتے تھے اور میں ان کو زبانی یاد رکھتا تھا۔

بعض حفاظ نے لکھا ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ نے علم الفرائض میں کوئی کتاب لکھی تھی لیکن اصل یہ ہے کہ عہد صحابہ میں جن صحیفوں کا ذکر ملتا ہے وہ زیادہ تر زکوٰۃ وغیرہ کے خاص خاص احکام سے متعلق تھے ورنہ پہلی صدی ہجری کے ختم تک نہ باقاعدہ تدوین حدیث کی طرف توجہ کی گئی اور نہ کہیں اس کا اہتمام کیا گیا۔ ابو جحیفہ کی روایت ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ حضرت علیؓ سے دریافت کیا۔

ہل عندکم کتاب کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے۔

فرمایا "لا الا کتاب اللہ او فہم اعطیہ" نہیں صرف کتاب اللہ ہے یا وہ سمجھ جو کسی

رجل مسلم او فانی ہذہ الصحیفۃ مسلمان کو عطا کی گئی ہو یا وہ جو اس صحیفہ میں ہے

ابو جحیفہ نے پوچھا "اس میں کیا ہے؟" بولے

العقل و فکاکہ الاسیر یعنی دیت کے اور قیدی کو رہا کرانے کے احکام اور ایک یہ حکم کہ کوئی

ولا یقتل مسلماً بکافر^{لہ} مسلمان کسی کافر کے قصاص میں قتل نہ کیا جائے۔

غرض کہ پہلی صدی ہجری تک یہی حال رہا۔

تحریک تدوین حدیث | جب عمر بن عبدالعزیز سرپر آرائے خلافت ہوئے اور آپ نے دیکھا کہ جن

بزرگوں کے سینوں میں اقوال و افعال نبویؐ کا ذخیرہ موجود ہے یکے بعد دیگرے اٹھتے چلے جا رہے

ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ آنے والی نسلیں ان سرچشمہائے سعادت سے بالکل محروم رہ جائیں تو

آپ نے ابوبکر بن محمد بن عمر بن حزم کو لکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حدیث اور سنت

آپ کو ملے اس کو لکھ لیجئے میں ڈرتا ہوں کہ کہیں علم مٹ نہ جائے اور علما فنا نہ ہو جائیں۔ اور

آپس میں مجالست کرو تا کہ جو شخص نہیں جانتا وہ بھی جان جائے۔"

ابوبکر بن محمد انصار مدینہ میں سے تھے۔ سلیمان بن عبدالملک اور عمر بن عبدالعزیزؒ کی

طرف سے مدینہ کے گورنر تھے۔ ۱۲۰ھ میں وفات پائی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ۹۹ھ سے

رجب ۱۰۱ھ تک خلیفہ رہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تدوین حدیث کی تحریک ۱۰۱ھ کے

لگ بھگ شروع ہو گئی تھی۔ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے حکم سے ابن شہاب زہری اور بعض اور

۱۰۱ھ بخاری باب کتابت العلم ۱۰۱ھ ادارہ معارف اسلامیہ لاہور کے دوسرے اجلاس منعقد لاہور میں ڈاکٹر زبیر صدیقی

کلکتہ یونیورسٹی نے "تدوین حدیث عہد نبوت میں" کے عنوان سے انگریزی زبان میں ایک تہایت محققانہ اور قابل قدر

مضمون پڑھا تھا جو ادارہ کی رپورٹ میں شائع ہو چکا ہے اس میں موصوف نے یہ ثابت کر نیکی کوشش کی ہے کہ

درحقیقت تدوین احکام کا کام سرکار رسالت کے عہد میں ہی شروع ہو گیا تھا لیکن افسوس ہے کہ ہم پورے

مضمون کے ساتھ اتفاق نہیں کر سکتے۔ موصوف جن کو مجموعہ ہائے احادیث کہتے ہیں وہ دراصل صحف تھے جن میں

بعض خاص خاص احکام درج تھے۔ ۱۰۱ھ بخاری کتاب العلم کیف یقبض العلم۔

محدثین عصر نے حدیث کے مجموعے مرتب کئے تھے۔

درس حدیث | دوسری صدی ہجری کے نصف اول کے ہوتے ہوتے درس حدیث کا عام چرچا ہو گیا۔ مدینہ، بصرہ، کوفہ، شام میں اس کے مستقل مراکز قائم تھے۔ جنہوں نے حضرت عکرمہ مولیٰ ابن عباس، نافع مولیٰ ابن عمر، سعید بن جبیر، مجاہد بن جبر، طاؤس بن کيسان، شہاب الدین زہری امام نحوی وغیرہ ایسے ائمہ حدیث و ارباب علم و فضل پیدا کئے۔

عہد بنی عباس میں | بنو عباس کے عہد حکومت میں جب علم و فن کا چرچا عام ہوا اور علوم و فنون کی تدوین شروع ہوئی تو اب علماء اسلام نے سب سے پہلے مختلف شہروں

میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال اور آپ کی سیرت مقدسہ مدون کرنے کی طرف توجہ مبذول کی۔ چنانچہ مکہ میں ابن جریج المتوفی ۱۵۱ھ نے مدینہ میں محمد بن اسحاق (۱۵۱ھ)

اور امام مالک بن انس (۱۵۹ھ) نے بصرہ میں، ربیع بن صبیح (۱۶۱ھ) سعید بن عروبہ (۱۵۶ھ) اور حماد بن سلمہ (۱۶۶ھ) نے کوفہ میں سفیان الثوری (۱۶۱ھ) نے شام میں امام اوزاعی (۱۵۶ھ) نے

یمن میں عمر (۱۵۳ھ) نے خراسان میں عبداللہ بن المبارک (۱۸۱ھ) نے اور مصر میں لیث بن سعد (۱۶۵ھ) نے الگ الگ مجموعے حدیث مدون کئے۔ ابن جریج کی وفات ۱۵۱ھ میں ہو گئی تھی اس لئے غالب یہ ہے کہ اس کا رخیر میں سبقت کا سہرا انھیں کے سر ہو گا۔

ان ائمہ حدیث نے یہ مجموعے اس جذبہ کے ماتحت مرتب کئے تھے کہ علماء کرام فنا ہو رہے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ علم بھی بالکل فنا ہو جائے۔ اس لئے انھوں نے ان کتب میں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کے ساتھ صحابہ کرام کے اقوال اور تابعین کے فتاویٰ بھی شامل کر دیئے۔ ان مجموعوں میں سے آج کل صرف موطا امام مالک پایا جاتا

ہے جس کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ جامعین حدیث نے اقوال صحابہ کی حفاظت میں بھی وہی اہتمام کیا جو انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی

تدوین و حفاظت میں کیا تھا۔

دوسری صدی ہجری کے ختم پر بعض ائمہ کو خیال ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو اقوال صحابہ اور فتاویٰ تابعین سے الگ کر کے ایک علیحدہ مجموعہ میں محفوظ کر دینا چاہئے چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر متعدد علمائے مسانید لکھیں جن میں مشہور یہ ہیں۔ عبید اللہ بن موسیٰ الجبسی الکوفی، مسدد بن مسدد البصری، اسد بن موسیٰ الاموی، نعیم بن حماد الخزازی، نزیل مصر۔ ان کے نقش قدم پر دوسرے علماء باعلام بھی چلے اور انھوں نے بھی مسانید لکھیں۔ اس سلسلہ میں امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ اور عثمان بن ابی شیبہ کے اسماء گرامی زیادہ نمایاں ہیں۔

کتب حدیث کی ترتیب | سب سے پہلے حدیث کے جو مجموعے مرتب ہوئے ان کی ترتیب ابواب فقہ میں اختلاف کے مطابق رکھی گئی تھی۔ مثلاً کتاب الطہارۃ لکھ کر ایک عنوان مقرر کر دیا، اور پھر طہارت سے متعلق جتنی احادیث تھیں ان سب کو اس باب میں یکجا کر دیا۔ اس کے برخلاف بعض علمائے احادیث کی تدوین روایۃ کے ناموں سے کی۔ مثلاً ابو ہریرہ سے جتنی روایتیں منقول ہیں وہ طہارت سے متعلق ہوں یا صوم سے سب کو ایک جگہ جمع کر دیا۔ پہلی قسم کی کتب حدیث کو علماء اربعین کی اصطلاح میں کتاب السنن اور دوسری قسم کی کتب کو مسند کہتے ہیں ان کے علاوہ بعض علمائے تھے جنہوں نے احادیث کو سنن اور مسانید دونوں کے طریقوں پر جمع کیا ان علماء میں ابو بکر بن ابی شیبہ کا نام زیادہ مشہور ہے۔

کتب حدیث میں | پچاس سال کی مدت میں جو کتابیں لکھی گئیں وہ سب مرتبہ کے لحاظ سے فرق مراتب برابر نہیں ہو سکتی تھیں کیونکہ بعض جامعین حدیث کو ایسے مواقع میسر تھے کہ وہ صحت کے متعلق خوب جانچ پڑتال کر سکتے تھے اور پھر ان کا جو سلسلہ اسناد تھا وہ سب سے زیادہ قوی اور معتبر تھا ان کے برخلاف دوسرے علماء وہ تھے جنہوں نے کچھ زیادہ تنقید سے کام نہیں لیا اور صحیح و سقیم میں فرق کے بغیر احادیث قلمبند کر دیں۔

حافظ ابن حجر امام بخاری کے عہد سے پہلے کی کتابوں کا ذکر کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:۔
 "امام بخاری نے جب ان سب تصانیف کو دیکھا۔ ان سے سیراب ہوئے اور ان کی خوشبو
 سونگھی تو انھوں نے دیکھا کہ وضع کے ماتحت ان میں صحیح احادیث بھی ہیں اور سقیم بھی
 بلکہ اکثر مجموعے ایسے تھے جن میں ضعیف حدیثیں موجود تھیں۔ یہ دیکھ کر انھوں نے غم
 کر لیا کہ وہ صحیح احادیث کو غیر صحیح احادیث سے الگ کر کے ایک مجموعہ میں شامل کر دیں گے۔"

تنقید احادیث | تیسری صدی ہجری کا زمانہ تدوین حدیث کی تاریخ میں سب سے زیادہ اہم ہے
 کیونکہ اس زمانہ میں حدیث کی سب سے زیادہ اہم کتابیں تالیف ہوئیں۔ تنقید روایہ کے اصول
 متعین ہوئے۔ جرح و تعدیل کے اسباب مقرر کئے گئے اور اب تک جس طرح متن حدیث
 کے یاد کرنے، پرکھنے اور اس کو سمجھنے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ اسانید کو محفوظ رکھنے۔
 اور ان کی صحت و سقم کی تحقیق و لغتیش کا بھی اہتمام ہونے لگا اور علم اسماء الرجال کے نام سے
 ایک مستقل علم کی بنیاد پڑی۔ اس عہد میں امام بخاری المتوفی ۲۵۶ھ نے الجامع الصحیح، امام مسلم
 المتوفی ۲۶۱ھ نے اپنی صحیح مرتب کی۔ اور ابن ماجہ المتوفی ۲۶۳ھ اور ابوداؤد المتوفی ۲۶۴ھ نے
 اپنی اپنی سنن۔ امام ترمذی المتوفی ۲۷۹ھ نے اپنی جامع اور امام نسائی المتوفی ۳۰۳ھ نے اپنی سنن
 کو مرتب کیا۔ یہ چھ کتابیں حدیث کی سب سے زیادہ مستند اور صحیح کتابیں سمجھی جاتی ہیں، اور
 ان کو "صحاح ستہ" کہتے ہیں۔

فن تنقید حدیث و اسناد کیوں ایجاد کیا گیا۔ اس کی بنیاد روایت و درایت کے کن
 اصول پر ہے؟ اور اس فن نے صحت و اعتبار حدیث کا پایہ کتنا بلند کر دیا؟ ان سب باتوں
 کو معلوم کرنے کے لئے پہلے وضع حدیث کی مختصر رواداد سن لینی چاہئے تاکہ محدثین کرام کی
 کوششوں کی پوری قدر ہو سکے۔

وضع حدیث کا فتنہ اور اس کا انسداد

جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام و تابعین عظام کے عہد میں احادیث کی باقاعدہ تدوین نہیں ہوئی جو کچھ حدیثیں تھیں زبانوں پر تھیں اور اسی طرح ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہوتی رہتی تھیں۔ اس تقریب سے منافقوں اور دشمنان اسلام کو احادیث وضع کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ ان لوگوں نے مسلمانوں میں اختلاط و ارتباط پیدا کر کے احادیث موضوعہ کی نشر و اشاعت شروع کی اور اس طرح اسلام کو نقصان پہنچانے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ ابن عدی کہتے ہیں "عبدالکریم بن ابی العوجار کو قتل کرنے کے لئے لیجایا گیا تو اس نے کہا "میں نے چار ہزار احادیث جن میں حرمت و حلت کے احکام ہیں وضع کر کے لوگوں میں پھیلا دی ہیں۔"

وضاعین حدیث کے | علامہ سیوطی نے ابن جوزی سے نقل کیا ہے کہ جن لوگوں کی احادیث میں مختلف طبقے جھوٹ وضع اور قلب پایا جاتا ہے ان کی چند قسمیں ہیں بعض وہ لوگ

ہیں جن پر زہد غالب تھا وہ احادیث کی حفاظت نہیں کر سکے یا ان کی کتابیں ضائع ہو گئیں۔ یحییٰ بن سعید القطان سے روایت ہے "کہ میں نے جھوٹ اس جماعت سے زیادہ کسی میں نہیں پایا جو اپنے تئیں خیر اور زہد کی طرف منسوب کرتی ہے۔" ۱۷

بعض وہ لوگ تھے جو اگرچہ ثقہ تھے لیکن ان کی عقلوں میں فتور آ گیا تھا اور وہ پھر بھی روایت حدیث سے باز نہیں آتے تھے۔ کچھ ایسے تھے جنہوں نے کوئی غلط روایت نقل کر دی، بعد میں انہیں اپنی غلطی کا علم بھی ہو گیا لیکن ازراہ سخن پروری انہوں نے رجوع نہیں کیا۔ ان

قرآن و حدیث سے چاہتے تھے اس لئے بعض وضاعین نے اپنے نظریہ کی تائید کے لئے جان بوجھ کر حدیثیں وضع کیں اور ان کا عام چرچا کیا۔

(۳) شخصی حکومت کے استبداد کی وجہ سے بعض لوگ ایسی محکومانہ ذہنیت رکھتے تھے کہ بادشاہ کو خوش کرنے کے لئے سرکارِ دو عالم پر تہمت طرازی سے بھی باز نہیں آتے تھے۔

غیاث بن ابراہیم کے متعلق مشہور روایت ہے کہ وہ ایک مرتبہ مہدی بن منصور کے پاس آیا مہدی کو کبوتر بازی کا بہت شوق تھا۔ غیاث نے یہ دیکھتے ہی اس کو خوش کرنے کے لئے حدیث وضع کر دی کہ سابق الا فی خفت او حافرا و جناح۔ مہدی نے اس وقت تو خوش ہو کر غیاث کو دس ہزار درہم دلا دیئے۔ لیکن جب وہ جانے لگا تو مہدی نے کہا "میں گواہی دیتا ہوں کہ تیری گدی اس شخص کی سی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط احادیث منسوب کرتا ہو، رسول اللہ نے او جناح نہیں فرمایا ہے تو نے ہم سے تقرب حاصل کرنے کے لئے اس لفظ کا اضافہ کر دیا ہے۔"

غرض یہ ہے کہ یہ اسباب تھے جن کی وجہ سے دشمنانِ اسلام نے احادیثِ موضوعہ کا انبار لگا دیا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ان وضاعین کی نامراد کوششوں کی وجہ سے حدیث کا تمام ذخیرہ ناقابلِ اعتبار و استناد قرار دیا جاسکتا ہے؟ کیا ان فتنہ پردازوں کی سرکوبی کے لئے ائمہ دین اور علماء اسلام نے جو عدیم النظر کوششیں کی ہیں وہ سب بے کار و بے فائدہ رہیں؟ کیا یہ صحیح ہے کہ ان وجاہلہ امت کا جادو چل گیا اور اب ہم اس قابل نہیں ہیں کہ کسی ارشادِ نبوی پر بھروسہ کر سکیں؟ کیا یہ درست ہے کہ وضع و کذب کے دریا میں حقانیت و صداقت کے چند قطرے ایسے رل رل گئے ہیں کہ اب ان کا کہیں سراغ نہیں لگ سکتا؟ کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید نے جس ذاتِ گرامی کو خود اسوۂ حسنہ کہا تھا۔ ان افترا پردازانہاتوں کی ملعون حرکات کے باعث اس کے اقوال و افعال اب ایسے تاریک پردوں میں مستور ہو گئے ہیں کہ ہم ان سے کوئی

حضرت ابو سعید خدریؓ سے کسی نے کہا کہ "آپ جو احادیث نقل کرتے ہیں کیا ہم ان کی کتابت نہ کریں؟" فرمایا "ہم تم کو کتابت نہیں کرائیں گے تم ہم سے روایات اسی طرح بیان کرو جس طرح ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں۔"

قرن اول میں کتابت حدیث سے اجتناب، حدیث سے بے اعتنائی پر نہیں بلکہ روایات حدیث میں کمال احتیاط پر مبنی تھا۔ علامہ قرطبیؒ نے امام مالکؒ کا ایک قول نقل کیا ہے۔

فرماتے ہیں۔

لم یکن القوم یکتبون انما كانوا
 یحفظون فمن كتب منهم الشئ
 فانما كان یکتبه لیحفظه فاذا
 لوگ پہلے لکھتے نہیں تھے۔ صرف یاد رکھتے
 تھے۔ ان میں سے اگر کوئی... کچھ لکھتا بھی تھا
 تو صرف یاد کرنے کے لئے لکھتا تھا۔ یاد ہو جانے
 حفظہ صحاح۔ ۱۰
 کے بعد اسے مٹا دیتا تھا۔

اس مقام پر ایک اور روایت کا نقل کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے جس سے عدم کتابت حدیث کے وجہ و اسباب پر کامل روشنی پڑتی ہے۔

عبدالرحمن بن الاسود اپنے والد سے روایت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں "ایک مرتبہ مجھے اور حضرت علقمہ کو کہیں سے ایک صحیفہ مل گیا۔ ہم دونوں اسے لیکر غروب آفتاب کے وقت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس گئے اور دروازہ پر بیٹھ گئے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے جاریہ سے فرمایا دیکھنا دروازہ پر کون ہے؟ جاریہ بولی علقمہ اور اسود حضرت ابن مسعودؓ نے ہم کو اجازت دیدی، گھر میں داخل ہو کر ہم نے وہ صحیفہ دکھایا اور کہا کہ یہ حدیث حسن ہے۔ حضرت عبداللہ نے جاریہ کو طشت میں بھر کر پانی لانے کا حکم دیا۔ جاریہ نے حکم کی تعمیل کی۔ آپ نے فوراً پانی سے بدست خود اس صحیفہ کو مٹانا شروع کر دیا اور نحن نقص عليك احسن القصص پڑھنے لگے۔ ہم نے کہا ذرا اس کو تو دیکھ لیجئے اس میں ایک عجیب حدیث ہے۔ لیکن حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ

پھر بھی نہ مانے اور اس صحیفہ کو مٹاتے ہی رہے اور فرمایا۔

ان هذه القلوب اوعية فاشغلوها یہ دل برتن ہیں۔ ان کو تم قرآن مجید سے پُر کرو

بالقرآن ولا تشغلوها بغيره اور اس کو دوسری چیز سے مت بھرو۔

ابو عبید جو اس قصہ کے ایک راوی ہیں اور سند میں مذکور بھی ہیں کہتے ہیں "معلوم

ہوتا ہے کہ یہ صحیفہ اہل کتاب سے لیا گیا تھا اس لئے حضرت ابن مسعودؓ نے اس کو دیکھنا

بھی مکروہ سمجھا۔"

غرض یہ ہے کہ یہ وجوہ تھے جن کی بنا پر عہد صحابہ میں ایک طرف کتابت و تدوین

حدیث نہیں ہوئی اور دوسری طرف انھوں نے احادیث کے قبول کرنے اور ان کی جانچ

پُر تال کرنے میں کافی اہتمام کرنا شروع کر دیا تاکہ احادیث صحیحہ غیر صحیحہ سے متمايز ہو جائیں۔

قبول حدیث میں صحابہ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں "جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

پر جھوٹ نہیں باندھا جاتا تھا۔ ہم احادیث قبول کرتے تھے لیکن جب

لوگ اس طرح کی باتیں کرنے لگے تو ہم نے آپ سے روایت کرنا ترک کر دیا۔" ایک اور حدیث

اس سے بھی زیادہ واضح ہے بشیر العدوی کہتے ہیں "میں ایک مرتبہ حضرت ابن عباس رضی

پاس آیا اور ان کے سامنے روایت بیان کرنے لگا۔ لیکن حضرت ابن عباسؓ نے اس پر کوئی

توجہ نہیں کی۔ میں نے کہا "ابن عباس! میں دیکھتا ہوں کہ آپ میری حدیث نہیں سنتے۔" فرمایا

ایک زمانہ تھا کہ جب کوئی شخص ہمارے سامنے قال رسول اللہ کہتا تو ہماری نگاہیں فوراً

اس کی طرف اٹھ جاتیں اور ہم بڑی توجہ سے وہ روایت سنتے تھے لیکن اب جبکہ لوگوں نے

خلط بلبط کر دیا ہے ہم ان سے صرف وہی روایتیں قبول کرتے ہیں جنہیں ہم جانتے ہیں۔"

اس احتیاط کی وجہ سے اگر کوئی صحابی ان میں سے کسی کے پاس کوئی کتاب لاتا تو وہ

اس میں جتنے حصہ کو صحیح سمجھتے رہتے دیتے اور باقی کو قلمزد کر دیتے۔

۱۰ جامع بیان العلم و فضلہ ج ۱ ص ۶۶ ۱۰ صحیح مسلم باب النہی عن الروایۃ عن الضعفاء۔

سفیان بن عیینہ سے روایت ہے کہ "ایک مرتبہ حضرت ابن عباسؓ کے پاس ایک شخص ایک کتاب لایا اس میں حضرت علیؓ کا کوئی فیصلہ تھا۔ حضرت ابن عباسؓ نے تھوڑے سے حصہ کو رہنے دیا اور باقی کو مٹا دیا" ۱۵

بے تحقیق روایت پر وعید | کسی روایت کو سننے کے بعد اس کو اگر بیان کرنا چاہتے تو پہلے اس کی

خوب چھان بین کر لیتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی

کفی بالمرء کذباً ان یحدث ایک آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے یہی کافی ہے

بکل ماسمع۔ ۱۶ کہ وہ ہر اس چیز کو بیان کر دے جو سنے۔

ان کے پیش نظر رہتا تھا۔ اس کے علاوہ آپ نے یہ پیش گوئی بھی کی تھی۔

سیکون فی اخر امتی اناس یجدونکم آخرا مت میں ایسے لوگ آئیں گے جو تم سے حدیثیں

ما لم تسمعوا انتم ولا ابائکم بیان کریں گے جن کو نہ تم نے سنا ہوگا اور نہ تمہارے

فایاکم وایاہم ۱۷ آبار نے تم ان سے بچتے رہنا۔

حضرت عبداللہ فرماتے تھے۔

ان الشیطان لیتمثل فی صورة شیطان مرد کی صورت میں متمثل ہو کر ایک

الرجل فیاتی القوم فی حدیثہم جماعت کے پاس آئیگا اور ان سے جھوٹ حدیث

بالحدیث من الکذب فی تفرقوا بیان کریگا جس کی وجہ سے وہ لوگ متفرق ہو جائیں

فیقول الرجل منہم سمعت گے اور ان میں کا ایک شخص کہے گا کہ میں نے یہ حدیث

رجلا عرف وجہہ ولا ادری ایسے شخص سے سنی ہے جس کا چہرہ میں پہچانتا ہوں

ما اسمی حدیث ۱۸ لیکن اس کا نام نہیں جانتا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ صحیح حدیث کی تحقیق میں بہت اہتمام کرتے تھے۔

۱۵ صحیح مسلم باب الروایۃ عن الضعفاء۔ ۱۶ ایضاً۔ ۱۷ صحیح مسلم باب النخی عن الروایۃ

عن الضعفاء ۱۸ صحیح مسلم باب الروایۃ عن الضعفاء۔

جب تک انھیں راوی سے پورا تعارف نہ ہوتا وہ کسی حدیث کو یوں ہی قبول نہ کرتے تھے۔
 کثرتِ روایت سے اجتناب | جو لوگ کثرت سے روایت کرتے تھے صحابہ کرام انھیں اچھا نہیں سمجھتے
 تھے کیونکہ ایسے حضرات سے کسی روایت کے باب میں غیر محتاط رہنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔
 طاہر حزاری لکھتے ہیں۔

اذ لا کثار مظنة للخطا والخطاء کیونکہ کثرتِ روایت سے خطا کا احتمال ہوتا ہے
 فی الحدیث عظیم الخطر ہے اور حدیث میں خطا بڑے خطرہ کا سبب ہوتی ہے۔
 حضرت ابو ہریرہؓ کثیر الروایۃ صحابی تھے حضرت عمرؓ نے ان پر سختی کی کہ وہ کثرت سے
 روایت نہ کیا کریں تو حضرت ابو ہریرہؓ نے بطور معذرت فرمایا۔

ان الناس یقولون اکثر ابو ہریرۃ لوگ کہتے ہیں کہ ابو ہریرہؓ کثرت سے روایت کرتا ہے
 ولولا لیتان فی کتاب اللہ ما حدثت اگر قرآن مجید میں دو آیتیں نہ ہوتیں تو میں کوئی حدیث
 حدیثاً تم یتلو ان الذین ینکمون روایت نہ کرتا۔ اس کے بعد آپ آیت ان الذین
 ما انزلنا من البینات الی قولہ الرجم ینکمون الایہ پڑھتے پھر فرماتے ہمارے بھائی
 ان اخواننا من المهاجرین کان مہاجرین بازار کے لین دین میں لگے رہتے تھے،
 یشغلہم الصفق بالاسواق اور ہمارے بھائی انصار اپنے مالی معاملات میں
 وان اخواننا من الانصار کان مصروف رہتے تھے ان کے برخلاف ابو ہریرہؓ
 یشغلہم العمل فی اموالہم و پر شکم ہونے کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
 ات اباہریرۃ کان ینزم رسول اللہ کے ساتھ رہتا تھا اور جبکہ انصار و مہاجرین
 صلی اللہ علیہ وسلم بشعب بطنہ نہ ہوتے تھے ابو ہریرہؓ ہوتا تھا اور جسے وہ یاد
 ویحضر ما لا یحضرون ویحفظ نہیں کرتے تھے ابو ہریرہؓ یاد کرتا تھا۔

مالا یحفظون۔ ۷۷

۷۷ توجیہ النظر الفصل الثالث ۷۷ صحیح بخاری باب حفظ العلم۔

اس احتیاط کی وجہ سے جلیل القدر صحابہ کی ایک جماعت تھی جو بہت کم روایت کرتی تھی ان میں حضرت ابو بکر، زبیر، ابو عبیدہ، عباس بن عبدالمطلب رضوان اللہ علیہم اجمعین زیادہ مشہور ہیں اور بعض بعض صحابی تو وہ تھے جو روایت ہی نہیں کرتے تھے مثلاً سعید بن زید بن عمرو بن نفیل حضرت عمرؓ خود بھی روایت کم کرتے تھے اور دوسروں کو بھی قلت روایت کی تاکید کرتے تھے۔ مسلمانوں کا ایک لشکر عراق کی طرف روانہ ہوا تو حضرت عمرؓ نے انھیں خطاب کر کے ارشاد فرمایا۔

جوّد القرآن و اقلوا الروایة
قرآن خوب اچھی طرح پڑھو اور رسول اللہ
عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کم کرو۔

بلکہ بعض اوقات تو غلط احادیث کی اشاعت کے خوف سے روایت حدیث کی ہی ممانعت کر دیتے تھے چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد لوگوں کو جمع کر کے فرمایا "تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی حدیثیں بیان کرتے ہو جن میں خود مختلف ہوتے ہو تمہارے بعد جو لوگ آئیں گے وہ اس سے بھی زیادہ اختلاف کریں گے۔ پس رسول اللہ کی حدیث بیان مت کیا کرو، اور تم سے کوئی بات دریافت کی جائے تو کہو "ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی کتاب ہے اس کے ہی حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام سمجھو"۔

حدیث پر شہادت | پھر ان کے سامنے کوئی معروف ثقہ شخص بھی حدیث بیان کرتا تو اسے بغیر شہادت کے قبول نہیں کرتے تھے۔ شہادت کے بعد اس حدیث کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثبوت قطعی ہو جاتا تو اس پر سختی کے ساتھ عامل ہوتے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت ابو بکرؓ کے پاس ایک عورت آئی اور عرض کیا کہ فلاں شخص جس کا انتقال ہو گیا ہے میرا تو اسہ تھا اور میں اس کی نانی ہوں متوفی کی میراث سے مجھ کو حصہ دلا دیجئے" آپ نے

نوٹ) یہ یاد رکھنا ضروری ہے جیسا کہ حافظ ذہبی نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد خود تصریح کی ہے حضرت ابو بکرؓ کی مزدور روایت حدیث کو سب سے روکنا نہیں بلکہ اس میں حتی الوسع احتیاط سے کام لینے کی تلقین کرنا ہے چنانچہ صحیح روایات سے ثابت ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کو کسی راوی کی دیانت و تقاہت کا یقین نہ ہوتا تھا تو آپ اس کی روایت کو قبول نہ فرماتے تھے اس سلسلہ میں بے شمار واقعات ملتے ہیں۔

فرمایا "تیرے متعلق نہ تو کتاب اللہ میں کچھ ہے اور نہ سنت میں ہونے کا مجھ کو علم ہے، لوگوں سے دریافت کروں گا پھر بتاؤں گا، آپ نے پوچھا تو حضرت مغیرہ بن شعبہ نے فرمایا "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سامنے نانی کو چھٹا حصہ دلایا ہے" حضرت ابو بکرؓ بولے "تمہارا کوئی شاہد بھی ہے؟ محمد بن مسلمہ نے شہادت دی کہ "ہاں میرے سامنے رسول اللہؐ نے نانی کو چھٹا حصہ دلایا ہے۔" خلیفہ اول نے یہ سُن کر اس عورت کو بھی سدس دلا دیا۔

صحیح بخاری و مسلم میں ابو سعید الخدریؓ سے روایت ہے ہم ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ابو موسیٰؓ گھبرائے ہوئے آئے، لوگوں نے اس گھبراہٹ کا سبب پوچھا بولے "میں حضرت عمرؓ کی دعوت پر ان کے مکان پر حاضر ہوا تھا۔ دروازہ پر تین مرتبہ دستک دی جواب نہیں ملا تو واپس چلا آیا۔ اس واقعہ کے بعد ایک ملاقات میں حضرت عمرؓ نے پوچھا تم فلاں دن آئے نہیں؟ میں نے پورا قصہ نقل کر دیا اور ساتھ ہی کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "تم میں سے کوئی شخص کسی کے مکان پر جا کر تین مرتبہ اجازت طلب کرے اور اس کو جواب نہ ملے تو اسے واپس آجانا چاہئے حضرت عمرؓ یہ سن کر بولے "اس حدیث پر اپنا کوئی گواہ لیکر آو ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔" اہل مجلس نے کہا "ہم میں سب سے چھوٹا اس کی شہادت دیگا چنانچہ میں (ابو سعید الخدریؓ) اٹھا اور حضرت عمرؓ کے روبرو حاضر ہو کر شہادت پیش کی خلیفہ ثانی بولے "ابو موسیٰ! میں تم کو متہم نہیں کرتا (تا قابل اعتبار نہیں سمجھتا) لیکن یہ معاملہ حدیث کا تھا اس لئے گواہ کی ضرورت تھی۔"

مسور بن مخرمہ کا بیان ہے "ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے ایک ساقط بچہ کے بارہ میں مشورہ کیا۔ مغیرہ بولے "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لوتڈی سے متعلق یہ فیصلہ کیا ہے حضرت عمرؓ نے فرمایا "اگر تم سچے ہو تو اس پر شہادت پیش کرو۔" محمد بن مسلم بولے میں شہادت دیتا ہوں کہ بیشک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فیصلہ کیا تھا۔"

ایک واقعہ اس سے بھی زیادہ صریح ہے حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ مسجد کی توسیع کے لئے

حضرت عباسؓ سے زمین طلب کی انھوں نے انکار کر دیا اور حدیث بیان کی کہ آپ زیادتی نہیں کر سکتے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اس پر گواہ پیش کیجئے ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔ حضرت عباسؓ نے ایک جماعت انصار سے اس کا ذکر کیا۔ حضرت عمرؓ کے سامنے ان لوگوں نے تصدیق کی کہ ہاں یہ حدیث صحیح ہے خلیفہ دوم نے یہ سُن کر فرمایا۔

انی لہما تھمک ولکنی اجبت میں آپ کو ناقابل اعتبار نہیں جانتا لیکن ان اثبت لہ

حضرت علیؓ کا بھی معمول تھا کہ ان کے سامنے کوئی شخص حدیث روایت کرتا تو آپ اس سے قسم لیتے تھے۔ ۷۲

قبول حدیث کے معاملہ میں یوں تو تمام صحابہ اور خصوصاً حضرت ابن عباسؓ، ابن عمرؓ، عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت علیؓ سبھی محتاط تھے لیکن اولیت کا سہرا خلیفہ اول حضرت ابوبکرؓ کے سر ہے۔ چنانچہ علامہ ذہبی فرماتے ہیں۔

وکان اول من احتاط فی قبول الاخبار حضرت ابوبکرؓ قبول اخبار میں سب سے پہلے احتیاط کرنے والے ہیں۔

حضرت عمرؓ نے متعدد حدیثوں پر شہادت طلب کر کے تثبت فی النقل کی سنت جاری کر دی اور لوگوں کو یہ بتا دیا کہ ایک حدیث کو دو وثقہ راوی بیان کریں تو وہ قوی ہو جاتی ہے۔ امام ذہبی حضرت عمرؓ کے حالات میں فرماتے ہیں۔

وهوالذی سن للمحدثین حضرت عمرؓ ہی وہ بزرگ ہیں جنہوں نے محدثین کے لئے التثبت فی النقل۔ تثبت فی النقل کی سنت جاری کی۔

پھر حضرت ابو موسیٰؓ والا مندرجہ بالا واقعہ نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں احب عمرا ان یتاکدا عندہ حضرت عمرؓ چاہتے تھے کہ ابو موسیٰؓ کی حدیث

خبر ابی موسیٰ بقول صاحبِ آخر کسی دوسرے شخص کی شہادت سے۔ وک ہو جائے
 ففی هذا دلیل علی ان الخبر یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کسی خبر کو دو ثقہ آدمی
 اذارواہ ثقتان کان اقویٰ و بیان کریں تو وہ حدیث منفرد کی نسبت زیادہ
 از حج مما الفرید بہ واحد و فی قوی اور قابل ترجیح ہو جاتی ہے اور حضرت عمرؓ
 ذلك حصّ علی تکثیر طرق نے ایسا کر کے طرق حدیث کی کثرت پر بھی لوگوں
 الحدیث لکی یرتقی عن درجۃ کو برا لگینتہ کیا ہے تاکہ وہ درجہ ظن سے نکل کر درجہ
 الظن الی درجۃ العلم اذ الواحد علم کی طرف آجائے کیونکہ واحد کے متعلق تو یہ
 يجوز علیہ النسیان والوهم وکا احتمال رہتا ہے کہ اس پر بھول اور وہم طاری
 یکاد يجوز ذلك علی ثقتین ہو گیا ہو لیکن دو ثقہ جن کی کسی نے مخالفت کی ہو
 لم یخالفها احد۔ ان کی نسبت ایسا احتمال نہیں ہو سکتا۔

امام ذہبی کا مقصد یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی اس احتیاط پسندی اور تشدد نے محدثین کے
 لئے شمع ہدایت کا کام کیا یعنی ان کے طرزِ عمل سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ کوئی حدیث کس وقت
 قبول کرنی چاہئے اور اس کا معیار کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ حضرت عمرؓ کے عہد میں جو حدیثیں
 راجح تھیں صحابہ کرام ان کو بے تکلف قبول کر لیتے تھے حضرت معاویہؓ فرماتے تھے۔

علیکم من الحدیث بما کان فی حضرت عمرؓ کے عہد میں جو احادیث راجح تھیں
 عہد عمرؓ فانذکان قد اخاف تم ان کو مضبوط پکڑ لو کیونکہ انھوں نے لوگوں
 الناس فی الحدیث عن رسول اللہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث
 صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے سے ڈرایا تھا۔

طلب حدیث کیلئے سفر | صحابہ کرامؓ جس طرح بے تحقیق روایت و حدیث کے قبول کرنے سے
 اجتناب کرتے تھے ان کو اگر معلوم ہوتا کہ کسی دوزر دراز مقام پر کسی ثقہ کے پاس کوئی حدیث ہے

تو اس کو حاصل کرنے کیلئے سفر کے دشوار گزار مرحلوں کو بھی طے کرتے تھے۔ حضرت جابر بن عبد اللہؓ کو معلوم ہوا کہ شام میں (ایک مہینہ کی مسافت پر) عبد اللہ بن انیس کے پاس ایک حدیث ہی انھوں نے اس کو حاصل کرنے کے لئے ایک اونٹ خریدا اور خدا کا نام لیکر روانہ ہو گئے۔ ایک مہینہ کی مسافت طے کرنے کے بعد منزل مقصود پر پہنچے۔ عبد اللہ بن انیس کے مکان پر تک دی وہ باہر آئے تو انھوں نے گلے لگا لیا آنے کی وجہ دریافت کی بولے "میں نے سنا تھا کہ آپ کے پاس سرکار رسالت کی ایک حدیث ہے، مجھ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اس حدیث کو سنے بغیر ہی مر جاؤں" پھر وہ حدیث حاصل کی۔

حدیث بیان کرتے وقت | روایت حدیث میں صحابہ کرام کی غایت احتیاط و تقویٰ کا اندازہ اس
دہشت اور خوف سے ہو سکتا ہے کہ ان میں بعض کا حال یہ تھا کہ صحیح طور پر قال

رسول اللہ بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ ابو عمر الشیبانی کہتے ہیں کہ میں حضرت ابن مسعودؓ کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا وہ خوف کے مارے قال رسول اللہ نہیں کہہ سکتے تھے اور اگر کہتے بھی تھے تو ان پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا اور کہتے تھے رسول اللہ نے "اس طرح فرمایا" یا "ایسا ہی فرمایا" یا "تقریباً ایسا ہی فرمایا" یا۔ یا۔ یا۔

ان آثار و روایات سے جن کا تاریخی اعتبار بہر حال مسلم ہے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں۔

(۱) صحابہ کرام روایت و قبول حدیث کے معاملہ میں حد درجہ احتیاط پسند تھے۔

(۲) وضائے عین و کذا بین کا طبقہ ان کے عہد میں ہی پیدا ہو گیا تھا۔

(۳) ان لوگوں کے فتنہ و شر سے بچنے اور صحیح احادیث کو محفوظ رکھنے کے لئے صحابہ کرام نے

قبول حدیث کے لئے ایک خاص معیار قائم کر لیا تھا کہ جو حدیث اس پر پوری اترتی تھی

اس کو بے تکلف قبول کرتے اور اس پر عمل پیرا ہوتے تھے۔

۱۔ امام بخاری نے اس روایت کو تمام و کمال ادب المفرد میں اور امام احمد اور ابو یعلیٰ نے اپنے اپنے مسند میں نقل کیا ہے۔ اور امام بخاری نے اپنی صحیح میں بھی باب فی طلب العلم کے ترجمہ میں اس کا ایک ٹکڑا نقل کیا ہے۔ ۲۔ تذکرۃ الحفاظ تذکرہ حضرت

(۴) صحابہ کرام کی ان احتیاط پسندیوں کے باعث صحیح و غیر صحیح احادیث میں ایک خط امتیاز کھینچ گیا اور وضائیں و کذابین کے تمام منصوبے پادر ہوا ثابت ہوئے۔

کثرت سے روایت کرنے والے صحابہ | یہ معلوم ہو چکا ہے کہ روایت حدیث میں تمام صحابہ برابر نہیں تھے بعض روایت کم کرتے تھے اور بعض زیادہ جنھوں نے روایات کثرت سے نقل کی ہیں ان میں حسب ذیل بزرگان امت نمایاں شہرت رکھتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عائشہؓ ام المؤمنین، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عباسؓ، جابر بن مالکؓ، حضرت ابو ہریرہؓ کی مرویات کی تعداد ۵۳۷ اور حضرت عائشہؓ کی روایتوں کی تعداد ۲۲۱۰ ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور انس بن مالکؓ کی روایتوں کی تعداد بھی قریب قریب حضرت عائشہؓ کے برابر ہے حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ کی حدیثیں ۱۵۰۰ سے متجاوز نہیں ہیں حضرت عمرؓ روایت کے معاملہ میں بے انتہا احتیاط پسند تھے آپ کی روایات ۵۳۷ سے زیادہ نہیں ہیں۔

مشرقین یورپ جو اسلام پر اعتراض کرنے کے لئے ایک ایک تنکے کا سہارا ڈھونڈتے ہیں انھوں نے حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ پر ان کی کثرت روایت کی وجہ سے بہت لے دے کی ہے اور بعض دریدہ دہنوں نے تو ان دونوں بزرگوں کی شان میں گستاخانہ الفاظ بک دینے سے بھی احتراز نہیں کیا۔ تعجب یہ ہے کہ مصر اور ہندوستان کے بعض ارباب علم تک ان سے متاثر ہو گئے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ان کے متعلق بھی ایک اجمالی گفتگو کر لی جائے۔

حضرت ابوہریرہؓ

حضرت ابوہریرہؓ کا اصلی وطن یمن تھا۔ قبیلہ دوس سے تعلق رکھتے تھے۔ جاہلیت میں نام عبد شمس تھا۔ مسلمان ہونے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کا نام عبدالرحمن رکھ دیا تھا۔ والد کا نام صخر تھا۔ ابوہریرہ کنیت تھی، ہریرہ عربی زبان میں چھوٹی بلی کو کہتے ہیں۔ اس کنیت کی وجہ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ ”میں اپنے گھر والوں کی بکریاں چراتا تھا۔ میرے پاس ایک بلی تھی اُسے میں رات کے وقت ایک درخت میں رکھ دیتا تھا۔ اور دن کو اسے اپنے ساتھ چراگاہ لیجاتا جہاں میں اس سے کھیلتا رہتا تھا اس بنا پر لوگ مجھے ابوہریرہ کہنے لگے“

اسلام اور جستجوئے علم | ستم میں بمقام خیبر اپنے قبیلہ کی ایک جماعت کے ساتھ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ اقدس پر دولتِ اسلام سے بہرہ اندوز ہوئے۔ آپ کو علم کی بڑی جستجو تھی۔ ہر وقت اسی دھن میں مصروف رہتے تھے اور اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کرنے میں بھی بڑے جری اور بے باک واقع ہوئے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے کسی نے بطور شکایت کہا کہ ابوہریرہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت کثرت سے روایت کرتے ہیں ”فرمایا“ پناہ بخدا ان کی روایات میں کسی قسم کا شک و شبہ نہ کرنا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ سرکارِ رسالت سے سوال کرنے میں بہت جری تھے اور اسی لئے ایسے ایسے سوالات کرتے تھے جن کو ہم لوگ پوچھ بھی نہیں سکتے تھے“

۱۵ مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۰۷ - ۱۶ ترمذی مناقب ابوہریرہؓ
۱۷ مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۱۰ -

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان کی اس جستجوئے علمی اور ذوق تحقیق و تلاش کا اعتراف تھا چنانچہ ایک مرتبہ انھوں نے سید کوئین سے دریافت کیا "قیامت کے دن کون خوش نصیب آپ کی شفاعت کا سب سے زیادہ مستحق ہوگا" ارشاد گرامی ہوا "تمہاری حرص علی الحدیث دیکھ کر مجھ کو پہلے سے خیال تھا کہ یہ سوال تم سے پہلے کوئی دوسرا نہیں کرے گا۔"

حضرت ابوہریرہؓ | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوہریرہؓ کے ذوق علم کی اس درجہ کیلئے دعا نبوی قدر کرتے تھے کہ ان کے علم کی نچنگی اور حافظہ کی قوت کے لئے دعائیں فرماتے تھے۔ زید بن ثابتؓ بیان کرتے ہیں "ایک دن میں اور ابوہریرہؓ اور ایک اور شخص مسجد میں بیٹھے ذکر خدا و دعا میں مشغول تھے۔ اتنے میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے۔ ہم لوگ خاموش ہو گئے۔ آپ نے فرمایا "اپنا شغل جاری رکھو، یہ سن کر میں اور وہ دوسرا شخص دعائیں کرنے لگے جن پر آپ آمین کہتے جاتے تھے۔ ہمارے بعد ابوہریرہؓ نے دعا کی "خدا یا جو کچھ میرے ساتھی مجھ سے قبل مانگ چکے ہیں وہ مجھے عطا فرما اور اس کے علاوہ ایسا علم بھی عنایت کر جس کو میں کبھی فراموش نہ کروں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر بھی آمین کہی۔ اب ہم دونوں نے عرض کیا "یا رسول اللہ! ہم کو بھی ایسا علم عطا کیا جائے جو فراموش نہ ہو۔ ارشاد حق بنیاد ہوا "وہ دوسری نوجوان (ابوہریرہ) کے حصہ میں آچکا۔" ایک مرتبہ انھوں نے بارگاہ رسالت میں صنعت حافظہ کی شکایت کی، آپ نے فرمایا "چادر پھیلاؤ" انھوں نے چادر پھیلا دی۔ آپ نے اس میں دونوں دست مبارک ڈالے۔ پھر فرمایا "اسے سینہ سے لگا لو" ابوہریرہؓ کہتے ہیں "اس کے بعد میں پھر کبھی نہیں بھولا۔"

۱۔ صحیح البخاری باب الحرس علی الحدیث - ۳۳ تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۲۶۶
 ۲۔ صحیح بخاری باب حفظ العلم -

جلالتِ علم | حضرت ابو ہریرہؓ کے ذوق و شوق، محنت و جستجو، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس شفقت و درعار کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ علم حدیث کے سب سے بڑے حافظ بن گئے اس کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان کو "علم کا ظرف" فرمایا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جو خود بھی صحابہ میں بڑے پایہ کے محدث ہیں۔ بیان کرتے ہیں کہ "ابو ہریرہؓ ہم سب میں اعلم بالحدیث تھے"۔

حافظ ذہبیؒ جو تنقیدِ روایہ میں مرتبہ بلند رکھتے ہیں فرماتے ہیں "ابو ہریرہؓ علم کا ظرف تھے اور صاحبِ فتویٰ ائمہ کی جماعت میں اونچا مقام رکھتے تھے"۔

حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں "ابو ہریرہؓ اپنے معاصر اولیوں میں سب سے بڑے حافظ تھے اور تمام صحابہ میں کسی نے حدیث کا اتنا ذخیرہ فراہم نہیں کیا"۔

امام شافعیؒ کی رائے تھی کہ ابو ہریرہؓ معاصر حفاظ حدیث میں سب سے بڑے حافظ حدیث تھے

روایات | حضرت ابو ہریرہؓ نے جو روایتیں بیان کی ہیں ان کی مجموعی تعداد ۵۳۷۴ ہے۔ ان میں ۳۲۵ متفق علیہم میں ۷۹ میں امام بخاری اور ۹۳ میں امام مسلم منفرد ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی کثرتِ روایت پر بعض لوگوں نے شک و شبہ کا اظہار کیا ہے، لیکن ہمیں غور کرنا چاہئے کہ کیا محض اس بنا پر کہ وہ روایات کثرت سے بیان کرتے تھے ہم ان پر کسی قسم کا شک کر سکتے ہیں؟ اس سلسلہ میں ہم کو چند باتیں نظر انداز نہ کرنی چاہئیں۔

(۱) کثرتِ روایت کا سبب کیا تھا؟

(۲) اجلہ صحابہ ان پر اعتماد کرتے تھے یا نہیں؟

(۳) ان کا حافظہ کیسا تھا؟

(۴) احادیث لکھتے تھے یا نہیں؟

(۵) نقلی روایت میں ان کا عام انداز احتیاط پسندانہ تھا یا نہیں؟
 (۶) جتنی کثیر روایتیں حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی
 محبت و صحبت کی مدت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کی تعداد عقلاً و عادتاً مستبعد ہے یا نہیں؟
 اب ہم ان میں سے ہر ایک کے متعلق بالترتیب گفتگو کرتے ہیں۔

کثرتِ روایت کے اسباب
 حضرت ابو ہریرہؓ کو اللہ تعالیٰ نے جس قدر ذوقِ علم، شوقِ تحقیق و جستجو عطا
 فرمایا تھا۔ اسی قدر ان کو علم کی اشاعت و توسیع کا بھی بڑا شوق تھا، اور
 ان کی دلی آرزو تھی کہ اقوالِ نبوی کا جو گنجینہ نایاب ان کے سینہ میں محفوظ ہے اس سے وہ
 دوسروں کو بھی فیضیاب کریں، ان کو اس کا نہ صرف ذاتی شوق تھا بلکہ قرآن مجید کی ایک آیت
 کے حکم اشاعتِ علم کو وہ اپنا ایک مذہبی فریضہ جانتے تھے۔ لوگوں نے اسی زمانہ میں ان پر
 اعتراضات کئے تو انھوں نے خود فرمایا "اگر سورۃ بقرہ کی یہ آیت۔

إِنَّ الدِّينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا
 مِنْ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ بَعْدِ
 مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ
 أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ
 اللّٰعِنُونَ ۝

بے شبہ وہ لوگ جو ہماری نازل کی ہوئی کھلی ہوئی
 نشانیوں کو اس کے بعد کہ ہم نے ان کو کتاب
 میں لوگوں کے لئے بیان کر دیا ہے۔ چھپاتے
 ہیں ان پر اللہ لعنت بھیجتا ہے اور لعنت بھیجنے
 والے بھی لعنت بھیجتے ہیں۔

نہ ہوتی تو میں کبھی کوئی حدیث نہ بیان کرتا۔

ایک طرف اشاعتِ علم کا یہ جذبہ اور دوسری طرف ان کو مواقع ایسے میسر تھے جو کسی
 دوسرے کو نہیں تھے۔ وہ خود ہی بیان کرتے ہیں "لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ ابو ہریرہؓ بہت
 حدیثیں بیان کرتا ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ میرے مہاجر بھائی بازاروں میں اپنے
 کاروبار میں لگے رہتے تھے۔ اور انصار صاحبِ جائداد تھے وہ اس کے انتظامات میں مصروف

۱۰ بخاری کتاب العلم۔

رہتے تھے۔ میں فارغ البال تھا۔ ہر وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہتا تھا جن اوقات میں وہ لوگ موجود نہیں ہوتے تھے۔ میں ان میں بھی حاضر رہتا تھا۔ اور دوسرے لوگ جن چیزوں کو فراموش کر دیتے تھے میں انہیں یاد رکھتا تھا۔

ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ نے ان سے پوچھا "تم کیسی حدیثیں بیان کرتے ہو حالانکہ جو کچھ میں نے دیکھا (یعنی افعال نبوی) اور سنا (قول نبوی) وہی تم نے بھی سنا اور دیکھا" بولے۔ "اماں! آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تطیب خاطر کے لئے زیبائش و آرائش میں مصروف رہتی تھیں اور مجھ کو خدا کی قسم کوئی چیز سرکارِ دو عالم سے غافل نہیں کر سکتی تھی۔"

اجلہ صحابہ ان پر | حضرت ابو ہریرہ کی اس خصوصیت کو دوسرے اجلہ صحابہ بھی تسلیم کرتے تھے
اعتماد کرتے تھے اور ان کے مخصوص حالات کے باعث ان کی روایتوں پر اعتماد کرتے تھے

ابو عامر روایت کرتے ہیں "ایک مرتبہ میں حضرت طلحہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص آیا اور کہنے لگا "ابو محمد! ہم کو نہیں معلوم یہ مینی (ابو ہریرہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ جانتا ہے یا تم" حضرت طلحہ نے فرمایا "اس میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ حدیثیں سنی ہیں جو ہم نے نہیں سنی اور انہیں وہ چیز معلوم ہے جسے ہم نہیں جانتے ہم لوگ مالدار تھے۔ ہمارے اپنے گھر تھے بال بچے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صبح شام آتے اور چلے جاتے تھے۔ ابو ہریرہ مسکین تھے ان کے پاس نہ مال تھا اور نہ ان کے متعلقین تھے۔ ان کا ہاتھ سرور کو نین کے ہاتھ میں تھا۔ جہاں سرکار جاتے تھے وہ بھی جاتے تھے۔ پھر مکر فرمایا ہم اس میں شک نہیں کرتے کہ وہ ایسی چیزیں جانتے ہیں جو ہم نہیں جانتے۔ اور انھوں نے ایسی حدیثیں سنی ہیں جو ہم نے نہیں سنی اور

ولم یتھمہ احد منّا انہ تقول ہم میں سے کسی نے ان کو اس کی تہمت نہیں لگائی

علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

قاله نقل هذا حدیث صحیحہ طرف کوئی قول ایسا منسوب کیا ہے جو آپ نے
الاسناد علی شرط الشیخین نہیں فرمایا۔

ایک مرتبہ حضرت ابو ہریرہؓ نے ایک حدیث بیان کی حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے وہاں
سے گذرتے ہوئے اس کو سنا تو فرمایا "ابو ہریرہؓ! دیکھو تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا
روایت کر رہے ہو، حضرت ابو ہریرہؓ فوراً کھڑے ہو گئے اور سیدھے حضرت عائشہؓ کی خدمت
میں حاضر ہو کر دریافت کیا آپ نے بھی یہ حدیث سنی ہے؟ فرمایا "ہاں! میں نے آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی ہے، اس پر حضرت ابو ہریرہؓ بولے "ہم کو رسول اللہؐ سے
نہ تو ازدواجی تعلق غافل رکھ سکتا تھا اور نہ بازاروں میں لین دین کرنا۔ میں آنحضرتؐ سے
صرف دو چیزیں طلب کرتا تھا۔ کوئی کلمہ جس کی آپ مجھ کو تعلیم دیں یا ایک لقمہ جو آپ مجھ کو
کھلائیں۔ ابن عمرؓ بولے

كنت الزمان رسول الله لے ابو ہریرہ۔ آپ ہم سب سے زیادہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم واعلمنا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے والے اور آپ
بحدیثہ کی احادیث کو جانتے والے تھے۔

ایک مرتبہ مروان کو حضرت ابو ہریرہؓ کی کوئی بات ناگوار ہوئی، اس نے غضبناک ہو کر
کہا لوگ کہتے ہیں "ابو ہریرہؓ بہت حدیثیں بیان کرتے ہیں۔ حالانکہ آنحضرتؐ کی وفات کے
کچھ ہی دنوں پہلے مدینہ میں آئے تھے" فرمایا "میں جب مدینہ میں آیا تو حضرت خیر میں تشریف
رکھتے تھے۔ اس وقت میری عمر تیس سال سے کچھ اوپر تھی اور آپ کی وفات تک سایہ کی طرح
آپ کے ساتھ رہا۔ آپ کے ساتھ ازواجِ مطہرات کے گھردن میں جاتا تھا آپ کی خدمت کرتا
تھا۔ آپ کے ساتھ لڑائیوں میں شریک ہوتا تھا۔ آپ کے ہمراہ حج کرتا تھا۔ اس لئے میں دوسرے
لوگوں سے زیادہ حدیثیں جانتا ہوں، خدا کی قسم وہ جماعت جو مجھ سے قبل آپ کی صحبت میں

تھی وہ بھی میری حاضر باشی کی معترف تھی اور مجھ سے حدیثیں پوچھتی تھی۔ ان میں حضرت عثمانؓ
 عمر طلحہ اور زبیرؓ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ جن کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہنچ کر
 قیام فرمایا تھا بڑے پایہ کے صحابی تھے لیکن اس کے باوصف وہ حضرت ابو ہریرہؓ سے
 روایت کرتے تھے کسی نے ان سے اس کی وجہ دریافت کی تو فرمایا میں ابو ہریرہؓ سے کوئی
 حدیث روایت کروں مجھ کو یہ زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ میں خود آنحضرت صلی اللہ
 علیہ وسلم سے روایت کروں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابو ایوبؓ کو اپنے حافظہ پر
 اتنا اعتماد نہیں تھا جتنا حضرت ابو ہریرہؓ کے حافظہ پر تھا۔ وہ ڈرتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو
 کہ میں براہ راست کسی حدیث کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کروں اور اس میں کچھ
 کمی بیشی ہو جائے۔

قوتِ حافظہ | حضرت ابو ہریرہؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ملازمت و قربِ مسلسل
 کا جو شرف حاصل تھا اس پر ان کی قوتِ حافظہ نے سونے پر سہاگے کا کام کیا تھا۔ پہلے
 معلوم ہو چکا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حافظہ کی قوت کے لئے دعا کی تھی
 اس کا اثر یہ ہوا جیسا کہ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ جو حدیث سن لیتے تھے بھولتے
 نہیں تھے۔ لوگ مختلف طریقوں سے امتحان لیتے تھے اور بالآخر انہیں حضرت ابو ہریرہؓ کی
 قوتِ حافظہ کا اعتراف کرنا پڑتا تھا۔

ایک مرتبہ مروان نے حضرت ابو ہریرہؓ کو بلایا اور اپنے کاتب کو تخت کے نیچے
 بٹھا کر ان سے حدیثیں پوچھنی شروع کیں۔ ابو ہریرہؓ بولتے جاتے تھے اور کاتب انہیں لکھتا
 جاتا تھا۔ حضرت ابو ہریرہؓ کو اس کی خبر بالکل نہیں تھی، ایک سال کے بعد مروان نے انہیں پھر
 طلب کیا اور اس نے وہی حدیثیں دریافت کیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے گذشتہ سال کی طرح

اس مرتبہ بھی بے کم و کاست بغیر زیادتی اور کمی کے وہ سب حدیثیں نقل کر دیں یہاں تک کہ ترتیب میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔

حدیث کی کتاب | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک تو غالباً حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حدیث کی کتابت نہیں کی کیونکہ اول تو انہیں اس کی فرصت ہی نہیں ہوتی ہوگی اور پھر انہیں یہ امید تھی کہ جس کسی حدیث میں کچھ شک ہوگا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کر کے اس کو رفع کر لیں گے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حضور کی وفات کے بعد قوتِ حافظہ کے باوجود ازراہ احتیاط انہوں نے حدیثیں قلمبند کرنی شروع کر دی تھیں اور پھر وہ جب تک اپنی کتاب نہ دیکھ لیتے کسی روایت کی توثیق و تصدیق نہ کرتے تھے۔ چنانچہ فضل بن حسن اپنے والد حسن بن عمرو کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت ابو ہریرہؓ کو ایک حدیث سنائی۔ انہوں نے اس سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ حسن بولے میں نے یہ حدیث آپ سے ہی سنی ہے۔ فرمایا اگر مجھ سے سنی ہے تو میرے پاس ضرور لکھی ہوگی۔ اس کے بعد ابو ہریرہؓ حسن کو ساتھ لیکر گھر گئے اور ایک کتاب دکھائی جس میں تمام حدیثیں درج تھیں۔ اس میں وہ حدیث بھی تھی۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا ”میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ اگر تم نے وہ حدیث مجھ سے سنی ہے تو ضرور میری کتاب میں ہوگی۔“

احتیاط | اس روایت سے ان کی احتیاط فی الروایت کا بھی علم ہوتا ہے کہ کسی حدیث پر یونہی حکم نہیں لگا دیتے تھے۔ بلکہ جب تک اس کی خوب تحقیق نہ کر لیتے نفیاً یا اثباتاً کچھ نہ فرماتے اس کے علاوہ ایک اور روایت ہے جس سے ان کی خشیتِ الہی اور حدیثِ رسول اللہ کے جذبہٴ احترام کا پتہ چلتا ہے۔ ایک مرتبہ شفیاء صبحی مدینہ آئے تو حضرت ابو ہریرہؓ کو دیکھا کہ بیہوش پڑے ہوئے ہیں اور لوگ ان کے چاروں طرف جمع ہیں۔ یہ ان کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ جب ذرا ہوش آیا تو درخواست کی کہ آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی ایسی حدیث سنائیے

۱۔ مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۱۰ ۲۔ مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۱۱۔

جس کو خود آپ نے سنا اور سمجھا ہو۔ ابو ہریرہ بولے "ہاں ایسی حدیث سناؤں گا۔ یہ کہا اور پرخ مار کر بیہوش ہو گئے۔ تین مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ ہوش میں آتے اور یہ کہہ کر کہ ہاں ایسی ہی حدیث سناؤں گا۔ پھر بیہوش ہو جاتے تھے۔ چوتھی بار بیہوشی کا حملہ اتنا شدید ہوا کہ غش کھا کے منہ کے بل گر پڑے۔ شفیاء صبحی نے ان کو سنبھال لیا اور دیر تک لئے بیٹھے رہے۔ افاقہ ہوا تو ایک حدیث بیان کی۔

حق گوئی | خشیت ربانی کے غلبہ کا ہی نتیجہ تھا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں نہایت بے باک اور جبری واقع ہوئے تھے۔ حضرت ابو ہریرہ مدینہ میں قیام پذیر تھے یہاں کا گورنر مروان تھا۔ ایک مرتبہ ابو ہریرہ اس کے گھر تشریف لے گئے تو تصویریں آویزاں دیکھیں۔ چپ نہ رہ سکے فرمایا میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جو خدا کی تخلیق کی طرح مخلوق بنا تا ہے۔ اگر اس کی قدرت میں ہے تو کوئی ذرہ غلہ یا جو پیدا کر کے دکھائے۔ ۵

عام تبصرہ | اس میں کچھ شک نہیں کہ حضرت ابو ہریرہ غزوہ خیبر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست اقدس پر مشرف باسلام ہوئے۔ اس لحاظ سے ان کو صرف چار سال صحبت نبوی سے فیضیاب ہونے کا موقع ملا۔ حضرت ابو ہریرہ سے جو حدیثیں منقول ہیں ان کی تعداد اس مدت کے پیش نظر بہ ظاہر زیادہ معلوم ہوتی ہے لیکن اگر اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ ان چار سالوں کی مدت میں حضرت ابو ہریرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک لمحہ کے لئے بھی جدا نہیں ہوئے۔ اور سفر و حضر میں، جلوت و خلوت میں، رزم میں اور ہزم میں ہر جگہ اور ہر مقام پر وہ آنحضرت کے ساتھ ساتھ رہے۔ اور اس شرف معیت کی وجہ سے وہ حضور کے تمام اقوال و افعال دیکھتے اور سنتے تھے۔ پھر خود بھی سوال کرنے میں بڑے جری اور بیباک تھے۔ تو یہ باور کر لینا بہت آسان ہو جاتا ہے کہ دراصل ان سب چیزوں کے لحاظ سے

حضرت ابوہریرہ کی مرویات کی تعداد مدتِ معیت کے اعتبار سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ بحث تو
 "مرویات ابوہریرہ" کی کمیت کے لحاظ سے تھی۔ اب حضرت ابوہریرہ کی قوتِ حافظہ، احتیاط
 فی الروایت، اجلہ صحابہ کا ان پر اعتماد و وثوق، خشیتِ ربانی، خوفِ قیامت، فقر و استغنا،
 اعلانِ حق میں جرأت و بے باکی، احادیثِ رسول اللہ کے ساتھ غایتِ درجہ عشق و محبت ان کا
 نہایت احترام، احادیث کی کتابت، ان سب چیزوں پر غور کیجئے تو مرویات ابوہریرہ کی کیفیت
 کے متعلق بھی صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کس پایہ کی ہیں اور ہمارے لئے کس درجہ لایق
 اعتبار ہو سکتی ہیں۔

یہ بھی واضح رہے کہ جن محدثین نے حضرت ابوہریرہ کی بعض حدیثوں پر کلام کیا ہے
 وہ اس پر مبنی نہیں ہے کہ انھیں حضرت ابوہریرہ پر اعتماد نہیں بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ
 حضرت ابوہریرہ سے محدث تک جو سلسلہ رواۃ ہے اس میں بعض لوگ ایسے ہیں جو غیر ثقہ یا متکلم فیہ
 ہیں ورنہ محدثین کا اتفاق ہے کہ الصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عَدُولٌ یعنی صحابی سب عادل ہیں۔
 وفات | حضرت معاویہ کے عہدِ خلافت میں ۵۸ھ میں وفات پائی۔ یہی وہ سال ہے جس
 میں حضرت عائشہ کا وصال ہوا ہے بعض روایتوں سے ۵۷ھ کا ثبوت بھی ملتا ہے۔
 مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۰۸

حضرت عبداللہ بن عباسؓ

نام و نسب | عبداللہ نام ابوالعباس کنیت، والد ماجد کا نام عباسؓ اور والدہ ماجدہ کا اسم گرامی ام الفضل لبابہ تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی اور ام المومنین حضرت میمونہؓ کے بھانجے تھے۔ ہجرت سے تین سال قبل مکہ میں پیدا ہوئے۔ حضرت عباسؓ ۸۸ھ میں فتح مکہ سے کچھ پہلے علانیہ حلقہ بگوش اسلام ہو کر مدینہ پہنچے تو حضرت عبداللہؓ بھی ساتھ تھے۔ اس وقت ان کی عمر گیارہ سال کی تھی۔ عمر کے اعتبار سے اگرچہ بچہ تھے لیکن حضرت عباسؓ کی تاکید کی وجہ سے خدمت نبوی میں اکثر حاضر رہتے تھے اور مجلس کے مذاکرات سنتے تھے۔

مستشرقین کو حضرت ابن عباسؓ پر بڑا اعتراض یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ان کی عمر صرف تیرہ یا چودہ برس کی تھی اور ظاہر ہے کہ یہ عمر بچپن کی ہے جبکہ انسان میں سنجیدگی، معاملہ رسی اور حقیقت بینی کا فقدان ہوتا ہے اس لئے جو حدیثیں آپ سے مروی ہیں ان کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے؟

اس اعتراض کا جواب معلوم کرنے کے لئے ہم کو امور ذیل پر غور کرنا چاہئے۔

(۱) حضرت ابن عباسؓ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنا تعلق تھا؟

(۲) آپ کا علمی پایہ کیا تھا؟

(۳) صحابہ میں آپ کو کیا وقعت و منزلت حاصل تھی؟

(۴) روایات میں ان کی احتیاط کا کیا عالم تھا؟

اب ہم ان میں سے ہر ایک کا جواب لکھتے ہیں۔

ابن عباسؓ پر رسول اللہ ﷺ کی نظر شفقت و تربیت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ابن عباسؓ کے ساتھ اول تو

قربت و رشتہ داری کا تعلق تھا۔ پھر یوں بھی آپ ان کی ذہانت

و فطانت، ہونہاری اور سلامت روی کے باعث ان سے محبت کرتے تھے۔ ابن عباسؓ آئندہ چل کر کیا ہونے والے تھے۔ ارباب نظر اس کا اندازہ اسی ایک بات سے کر سکتے ہیں کہ ان کی پیدائش کے بعد حضرت عباسؓ انھیں خدمت نبوی میں لیکر حاضر ہوئے تو آپ نے اپنے لعابِ دہن سے اس بچہ کے کام و دہن کی ضیافت کر کے اس کی دستاویز ارجبندی و بخت بلندی پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سینہ سے لگا کر دعا کی اللہم علمہ الحکمتہ

”اے اللہ تو انھیں حکمت سکھائے“ بعض روایتوں میں حکمت کے بجائے فقہ کا لفظ آتا ہے۔

اوپر معلوم ہو چکا ہے ام المومنین حضرت میمونہؓ حضرت ابن عباسؓ کی خالہ تھیں۔ وہ ان کو نہایت عزیز رکھتی تھیں۔ اس بنا پر آپ اکثر حضرت میمونہ کے گھر میں رہتے۔ اور کبھی کبھی رات کو بھی یہیں سو جاتے تھے۔ اس تقرب سے انھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتگذاری کا شرف حاصل ہو جاتا تھا۔

ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شب میں نماز کے لئے بیدار ہوئے۔ ابن عباسؓ نے وضو کے لئے پانی لا کر رکھ دیا۔ آپ نے پوچھا ”پانی کون لایا تھا؟“ حضرت میمونہؓ بولیں عبد اللہؓ سرور کائنات نے خوش ہو کر دعائیں دیں ”اللہم فقہہ فی الدین و علمہ التاویل اے خدا ان کو مذہب کی صحیح سمجھ عطا فرما۔ اور تاویل کا طریقہ سکھا۔“

حضرت میمونہؓ کے ہی گھر کا دوسرا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابن عباسؓ تہجد کی نماز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے کھڑے ہوئے۔ آپ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انھیں اپنے برابر کھڑا کر لیا۔ لیکن وہ حیران و ششدر ہو کر رہ گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز سے

فارغ ہو کر دریافت کیا "کیا حال ہے؟" بڑے "یا رسول اللہ! کیا آپ کے برابر کھڑا ہونا کسی کے لئے مناسب ہے حالانکہ آپ رسولِ خدا ہیں" یہ سن کر سید دو عالم بہت خوش ہوئے۔ اور ان کے لئے علم و فہم کی زیادتی کی دعا فرمائی۔

وفاتِ نبوی کے وقت | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت حضرت ابن عباسؓ کی عمر کیا تھی؟ اس میں اختلاف ہے۔ سعید بن جبیر نے خود حضرت

ابن عباسؓ سے جو روایت بیان کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عمر پندرہ سال کی تھی لیکن غالباً یہ زیادہ صحیح ہے کہ اس وقت آپ تیرہ برس کے تھے۔ اب غور کیجئے تیرہ سال کی عمر کا ایک تندرست بچہ اور بالخصوص عرب ایسے گرم ملک کی آب و ہوا میں رہنے والا اچھا خاصہ جوان اور ذی شعور و احساس ہو جاتا ہے اور ایک معمولی قسم کا دانا و بینا انسان بھی اس عمر کے بچہ کو اور اس کے عام اطوار و حرکات کو دیکھ کر یا طینانِ تامم اس کی آئندہ زندگی کے متعلق پیش گوئی کر سکتا ہے۔ پس اس عمر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت ابن عباس کے ساتھ غیر معمولی محبت و شفقت ظاہر کرنا۔ اور متعدد مواقع پر ان کے لئے دعائیں فرمانا اور حضرت ابن عباسؓ کو دوسروں کی نسبت آپ سے قرب و اتصال کے مواقع کا میسر ہونا یہ سب اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت ابن عباسؓ امت کے بہت بڑے ذمہ دار عالم اور شریعت و مذہب کے رموز و اسرار کے امین ہونے والے ہیں۔

علمی کم سال | چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کے مطابق ہی ہوا کہ حضرت ابن عباسؓ علم و حکمت کے ایک بحرِ ناپیدا کنار ہو گئے۔ قرآن تفسیر۔ فقہ۔ حدیث۔ لغت اور شاعری ان میں کوئی علم ایسا نہیں تھا جس میں ان کو نہایت تامہ حاصل نہ ہو۔

مستشرقین حضرت ابن عباسؓ کی کثرتِ روایت کو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ان کی کم عمری کو دیکھ کر ان کی روایتوں پر شک و شبہ کا اظہار تو کرنے

لگتے ہیں۔ لیکن حضرت ابن عباسؓ نے جس قدری ماحول میں تربیت پائی اور پھر خود انہوں نے جس ذوق و شوق اور محنت و کاوش سے علم و کمال کی تحصیل کی۔ اور اجلہ صحابہ کے حیات ہونے کی وجہ سے جو ان کو اس کے بیش از بیش مواقع حاصل تھے ان سب چیزوں کو بالکل نظر انداز کر جاتے ہیں۔

علمی شوق | ذیل میں چند واقعات نقل کئے جاتے ہیں جن سے حضرت ابن عباسؓ کے شوق علم کا اندازہ ہوگا۔

حضرت ابن عباسؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک انصاری سے کہا کہ رسول اللہؐ وفات پا گئے۔ لیکن آپ کے اصحاب زندہ ہیں، چلو ان سے علم حاصل کریں۔ انصاری بولے ابن عباس! لوگ خود علم میں تمہارے محتاج ہیں۔ پھر تم دوسروں کے پاس کیوں جاتے ہو؟ حضرت ابن عباسؓ نے یہ سن کر انھیں چھوڑ دیا اور تنہا تحصیل علم کے لئے نکل پڑے۔ تحقیق و جستجو کی فراوانی کا یہ عالم تھا کہ جس کسی شخص کے پاس انھیں کوئی حدیث معلوم ہوتی محنت و مشقت برداشت کر کے وہاں پہنچتے اور اطلاع دیتے وہ شخص گھر سے نکل آتا اور کہتا ابن عم رسول! آپ نے کیسے تکلیف کی۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے "میں نے سنا ہے کہ آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث سنی ہے" وہ کہتا "ابن عم رسول! آپ نے کیوں تکلیف کی کسی اور کو بھیج دیا ہوتا۔ فرماتے نہیں یہ میرا کام تھا اس لئے مجھ کو ہی آنا چاہئے تھا۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں انصاری کا حال یہی رہا۔ جب لوگ میرے پاس اکٹھے ہونے لگے تو انصاری نے کہا یہ نوجوان مجھ سے زیادہ عقلمند تھا۔"

ابورافع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے اس لئے ان کو اقوال و افعال نبوی سننے اور دیکھنے کا موقع زیادہ ملا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ ان کے پاس ایک کاتب کو لیکر آتے اور پوچھتے جاتے کہ بتاؤ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں فلاں دن

کیا کیا کیا۔ ابورافع بیان کرتے جاتے اور کاتب قلمبند کرتا جاتا۔^{۱۰}

صحابہ میں آپ کی | حضرت ابن عباسؓ کی ذاتی محنت و کوشش، تلاش و جستجو، بہترین تربیت،
قدر و منزلت | عمدہ ماحول اور پھر سب سے زیادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مشفقانہ
دعاؤں کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ صحابہ کرام میں علم و فضل کے اعتبار سے نہایت نمایاں مقام کے
مالک ہو گئے۔ اکثر اکابر صحابہ جو عمر اور مرتبہ میں ان سے کہیں زیادہ تھے انھیں بھی ان کے سامنے
قصورِ علم کا اعتراف کرنا پڑتا تھا۔

ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کانتارتقا ففتقنا
ہمما" کا مطلب دریافت کیا انھوں نے اس شخص کو حضرت ابن عباسؓ کے پاس بھیج دیا۔ اس
نے پوچھا تو انھوں نے فرمایا۔

"آسمان کا رتق یہ تھا کہ پانی نہ برساتا تھا اور زمین کا رتق یہ تھا کہ اس سے نباتات
نہ اگتی تھیں۔ پھر اللہ نے ان میں فتق پیدا کر دیا۔ تو آسمان سے بارش ہونے لگی۔ اور زمین سے
نباتات اُگنے لگے سائل نے واپس آ کر حضرت ابن عمرؓ کو یہ جواب سنایا تو انھوں نے کہا۔

لقد اوتی ابن عباس علماً ابن عباسؓ کو واقعی سچا علم دیا گیا ہے پہلے
صدقا لقد كنت اقول ما لعجبي مجھ کو تعجب ہوتا تھا کہ ابن عباسؓ تفسیر
جراة ابن عباس علی تفسیر قرآن میں کیسی جرات کرتے ہیں۔ لیکن
القرآن فالان قد علمت اب مجھ کو معلوم ہو گیا کہ واقعی ان کو علم
انہ قد اوتی علماً ہے دیا گیا ہے۔

عمر بن حبشی کہتے ہیں "میں نے ایک مرتبہ حضرت ابن عمرؓ سے کسی آیت کا مطلب
پوچھا تو بولے "ابن عباسؓ کے پاس جاؤ۔ اب جتنے لوگ بھی باقی ہیں خدا نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم
پر جو نازل کیا تھا ان سب لوگوں میں ابن عباسؓ اس کے سب سے بڑے عالم ہیں۔"

علم بالسنت کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ صحابہ کرام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول یا فعل کے متعلق اختلاف ہوتا تو وہ حضرت ابن عباس کی ہی طرف رجوع کرتے تھے۔ ایک دفعہ صحابہ میں اختلاف اس مسئلہ میں ہوا کہ سرور کونین نے احرام کہاں سے باندھا تھا؟ سعید بن جبیر نے ابن عباس سے کہا ابن عباس! مجھ کو حیرت ہے کہ صحابہ میں حضور کے احرام باندھنے کی جگہ سے متعلق اتنا شدید اختلاف ہے "آپ نے فرمایا "اس مسئلہ میں میری معلومات سب سے زیادہ ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی حج کیا تھا۔ اس لئے اختلاف اور بھی زیادہ ہو گیا ہے۔ سبب یہ ہے کہ جب آپ نے مسجد ذوالحلیفہ میں دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد احرام باندھا اور لبیک کہنا شروع کیا تو جو لوگ اس وقت موجود تھے انہوں نے اسی کو یاد رکھا پھر جب اونٹنی روانہ ہوئی اور آپ نے پھر لبیک کہا تو جو لوگ اس وقت موجود تھے وہ یہ سمجھے کہ آپ نے یہیں سے ابتدا کی ہے۔ پھر جب آپ بلند مقام پر چڑھے اور لبیک کہنا شروع کیا تو جو لوگ اس وقت آکر ملے وہ سمجھے کہ آپ نے ابتدا یہیں سے کی ہے لیکن میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آپ نے مسجد میں احرام باندھا اس کے بعد جب اونٹنی روانہ ہوئی اس وقت۔ اور جب بلند مقام پر چڑھے۔ تب دونوں مرتبہ لبیک کہتے رہے۔"

یہ اور اس طرح کے دسیوں واقعات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام بڑے بڑے صحابہ حضرت ابن عباس کی جلالت علم و کمالِ فضیلت کے معترف تھے اور عمر میں ان سے کم ہونے کے باوجود وہ ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ کسی نے ایک مرتبہ بھی ان پر عدم اعتماد کا اظہار نہیں کیا۔ اپنے مختلف فیہ مسائل میں انہیں کی طرف رجوع کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ ایسے مردم شناس تشددی الاسلام بزرگ حضرت ابن عباس رضی کی کم عمری کے باوجود ان کو شیوخ بدر کی مجلسوں میں برابر کا شریک رکھتے تھے کسی نے کہا وہ تو

ہمارے لڑکوں کے برابر ہیں" آپ نے فرمایا "تم ان کا مرتبہ جانتے ہو؟"

روایت میں احتیاط | اس علم و فضل اور کمال و مہارت کے باوجود روایت کے معاملہ میں بے انتہا محتاط واقع ہوئے تھے۔ وہ حدیث بیان کرتے وقت اس کا بڑا خیال رکھتے تھے کہ کوئی غلط روایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہ ہو جائے۔ پہلے کسی مقام پر گزر چکا ہے کہ جب لوگوں نے رطب دیا بس ہر قسم کی روایتیں بیان کرنی شروع کر دیں تو حضرت ابن عباسؓ نے روایت بیان کرنا ہی ترک کر دیا۔

وہ لوگوں سے فرماتے ہیں قال رسول اللہ کہتے وقت یہ خوف دامنگیر نہیں ہوتا

کہ تم پر عذاب نازل ہو جائے یا زمین شہت ہو جائے اور تم اس میں سما جاؤ۔

مرویات کی تعداد | عموماً کہا جاتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کثیر الروایت تھے لیکن ان سے جو

روایتیں مروی ہیں ان کی مجموعی تعداد ۲۶۶ بتائی جاتی ہے جن میں سے ۵ متفق علیہ ہیں

یعنی ان کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ دونوں نے اپنی تصنیف میں نہیں نقل کیا ہے ان کے علاوہ ۱۸۵

روایتوں میں امام بخاریؒ منفرد ہیں اور ۴۹ میں امام مسلمؒ

حضرت ابن عباسؓ نے ۶۸ھ میں بصرہ سال اس جہان فانی کو الوداع کہا اب

اگر آپ کی یہ عمر پیش نظر رکھی جائے اور پھر اس کے ساتھ ہی آپ کے شوق تحصیل علم، محنت

و جستجو اور شب و روز کی مصروفیت و انہماک کو دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ

حدیثوں کی یہ تعداد کچھ زیادہ نہیں ہے اور دراصل یہ بھی حضرت ابن عباسؓ کی غایت احتیاط

کا نتیجہ ہے۔

اس تفصیل سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں۔

۱۸ بخاری کتاب التفسیر باب قولہ فسمی بجد ربک - ۱۲ صحیح مسلم باب النہی عن الروایۃ عن الضعفاء۔

۱۹ مسند دارمی باب ما یتقی من تفسیر حدیث النبی صلعم - ۱۵ تہذیب الکمال ص ۲۰۲۔

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابن عباسؓ پر ایک خاص نظر شفقت و تربیت رکھتے تھے۔

(۲) علم و فضل میں آپ کا مرتبہ نہایت اعلیٰ تھا۔

(۳) صحابہؓ میں آپ کو بڑی وقعت و منزلت حاصل تھی۔

(۴) روایت میں حضرت ابن عباسؓ حد درجہ محتاط واقع ہوئے تھے۔

ان سب حقیقتوں کے پیش نظر بتاؤ کہ کیا ایک لمحہ کے لئے بھی حضرت ابن عباسؓ پر شک و شبہ کا اظہار کیا جاسکتا ہے؟ یہاں سوال اس کا نہیں ہے کہ بعد والے لوگوں نے روایتوں میں کیا خلط ملط کر دیا جس کی وجہ سے تمام مرویات ابن عباسؓ درجہ قبول حاصل نہیں کر سکیں۔ یہاں تو صرف ثابت کیا گیا ہے کہ صحابہؓ میں جو بزرگ کثیر الروایت تھے اور جن کی کثرت روایت ہی مستشرقین کی نظر میں شک و شبہ کا باعث ہوتی ہے۔ وہ کس پایہ کے بزرگ تھے؟ اور کیا ان بزرگوں کی کثرت روایت کے باعث یہ کہا جاسکتا ہے کہ عہد صحابہؓ میں احادیث کا ذخیرہ اتنا مشتبہ ہو گیا تھا کہ بعض بڑے بڑے صحابہؓ بھی اس سے مبرا قرار نہیں دیئے جاسکتے؟

صحابہؓ سب عادل ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت ابن عباسؓ یہی دو جلیل القدر صحابی ہیں۔ جن پر ان کی کثرت روایت کی وجہ سے بعض گستاخوں نے زبان اعتراض کھولی ہے ان کے علاوہ جو صحابہؓ کرامؓ ہیں ان پر نہ کچھ ایسے زیادہ اعتراضات کئے گئے ہیں اور نہ فرداً فرداً ان میں سے ہر ایک پر گفتگو کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ ائمہ اسلام نے جرح و تعدیل کے جو اصول مقرر کئے ہیں صحابہؓ کرامؓ کی مقدس ذات ان سے بہت بلند و بالا ہے اور وہ سب کے سب عدول اور ثقہ ہیں۔

حافظ ابن حجرؒ نے اصحابہ کے مقدمہ میں فصل ثالث کے ماتحت اس پر تفصیلی بحث کی ہے

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس کا اقتباس درج کیا جائے۔ فرماتے ہیں:-

”سب اہل سنت اس پر متفق ہیں کہ تمام صحابہؓ عادل ہیں، چند مبتدع لوگوں کو چھوڑ کر

کسی کا اس میں اختلاف نہیں ہے۔ خطیب نے کفایہ میں اس پر ایک نفیس فصل لکھی ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ صحابہ کی عدالت تو اس لئے ثابت ہے کہ خود خدا نے ان کی تعدیل کی ہے اور ان کی طہارت و پاکیزگی کی خبر دی ہے مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ - اور وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا اور لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ - وَالسَّائِقُونَ الْأَوْلَىٰ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ - یہ اور ان کے علاوہ اور آیات کثیرہ اور احادیث صحیحہ میں جن سے صحابہ کی عدالت و ثقاہت یقینی طور پر معلوم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس تعدیل کے بعد اب وہ انسانوں میں سے کسی کی تعدیل کے محتاج نہیں ہیں اور اگر اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے صحابہ کرام کی تعدیل میں یہ آیات و احادیث نہ وارد ہوتیں تب بھی ان کی بے مثل خدمات اسلام یعنی ہجرت، جہاد، اسلام کے لئے جان و مال کی قربانی، آبار اور بناؤں کا قتل، دین میں خیر خواہی و خیر اندیشی، قوت ایمان و یقین، ان کی عدالت و نراہت کا اور اس بات کا یقین دلانے کے لئے کافی ہیں کہ وہ اپنے بعد میں آئینوالے لوگوں اور تمام تعدیل کرنے والوں سے افضل و اعلیٰ ہیں۔ تمام علماء کا مسلک یہی ہے۔

ابوزرعہ رازی کہتے ہیں جب تم کسی شخص کے متعلق سنو کہ وہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے کسی کی تنقیص کر رہا ہے تو سمجھ لو کہ وہ زندقہ ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول حق ہے، قرآن حق ہے اور جو کچھ قرآن مجید لایا ہے وہ حق ہے اور یہ سب

کچھ ہم تک صحابہ کرام کی وساطت سے ہی تو پہنچا ہے اور یہ لوگ (صحابہ پر جرح کرنے والے) چاہتے ہیں کہ ہمارے گواہوں (صحابہ) پر جرح کریں تاکہ اس طریقہ سے کتاب و سنت کو ناقابل اعتبار قرار دیدیں۔ یہ لوگ خود اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ ان پر جرح کی جائے۔ یہ زیادہ ہیں۔

صحابہ کی فضیلت میں احادیث بھی بہت کثرت سے آئی ہیں مثلاً ترمذی اور ابن جان نے اپنی "صحیح" میں عبداللہ بن مغفل کی حدیث نقل کی ہے کہ "میرے اصحاب کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے اللہ سے ڈرو، ان کو اپنے طعن و تشنیع کا نشانہ نہ بناؤ، جو شخص ان سے محبت رکھتا ہے وہ مجھ سے محبت رکھنے کے باعث ان سے محبت کرتا ہے اور جو ان سے بغض رکھتا ہے وہ مجھ سے بغض رکھنے کی وجہ سے ان سے بغض رکھتا ہے جس نے ان کو تکلیف پہنچائی اس نے مجھ کو تکلیف پہنچائی اور جس نے مجھ کو تکلیف پہنچائی اس نے اللہ کو تکلیف پہنچائی اور قریب ہے کہ اللہ اس کو اپنی گرفت میں لے لے۔"

ابو محمد بن حزم فرماتے ہیں:-

سب صحابہ یقیناً اہل جنت ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتِلًا أُولَئِكَ أَكْبَرُ دَرَجَةً مِنَ الَّذِينَ أَنْفَقُوا مِنْ بَعْدِ وَقَاتَلُوا وَكُلًّا وَعَدَّ اللَّهُ الْحَسَنَىٰ" اور ایک جگہ ارشاد ہے "إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَّا الْحَسَنَىٰ أُولَئِكَ عِنْدَنا مَبْعَدُونَ" پس یہ بات ثابت ہوگئی کہ تمام صحابہ اہل جنت ہیں اور ان میں سے کوئی ناریں داخل نہیں ہوگا کیونکہ ان آیتوں کا خطاب انہیں سے ہے۔

عبداللہ بن ہاشم الطوسی بروایت وکیع بیان کرتے ہیں کہ حضرت سفیان فرماتے تھے

”قل الحمد لله وسلام علی عباده الذین اصطفیٰ میں عباده الذین اصطفیٰ

سے مراد صحابہ کرام ہیں۔“

حافظ ابن حجر نے اپنی تقریر میں ابو زرہ رازی کے حوالہ سے جو قول نقل کیا ہے عقلی اعتبار سے وہ عدالت صحابہ کی قوی ترین دلیل ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہر جماعت میں چند لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اس جماعت کی عملی تشکیل کرتے ہیں اس کے لئے قواعد و ضوابط وضع کرتے ہیں۔ اور اس کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے ہر بڑی سے بڑی قربانی کے پیش کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتے۔ جماعتی اصول کے مطابق یہ لوگ ہر قسم کی تنقید سے بلند و بالا ہوتے ہیں۔ اور ہونا بھی ہی چاہئے کیونکہ اگر ان پر بھی اصول جرح و تعدیل جاری کئے جائیں تو پھر وہ جماعت جماعت باقی نہیں رہ سکتی۔

یہ ظاہر ہے کہ ہم تک کتاب و سنت کا جو کچھ ذخیرہ پہنچا ہے حضرات صحابہ کرام کی وساطت سے ہی پہنچا ہے۔ اگر ان پر بھی اور لوگوں کی طرح جرح و تعدیل کی جائے گی تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ سنت کا کیا ذکر خود قرآن مجید بھی (معاذ اللہ) ناقابل اعتبار قرار پا جاتا ہے۔ کیونکہ قرآن مجید کے قابل اعتماد ہونے کی دلیل آپ کے پاس بجز اس کے کوئی نہیں ہے کہ وہ نقل متواتر کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے۔ نقل متواتر کی تعریف یہ ہے کہ ہر زمانہ میں اس روایت کو ایسی کثیر جماعت نے نقل کیا ہو کہ ان سب کا کذب پر متفق ہونا عاۓدۃ محال ہو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ جماعت افراد سے مرکب ہوتی ہے اور چونکہ ہر فرد میں کذب بیانی کا احتمال ہے اس لئے جماعت میں بھی اس بات کا احتمال ہو سکتا ہے کہ وہ سب کی سب کذب پر متفق ہو گئی ہو۔ اور سب سے پہلی جماعت جس نے قرآن مجید نقل کیا صحابہ کی ہی ہے۔ پس اگر صحابہ کی جماعت کو جرح و تعدیل سے بلند و بالا نہ تسلیم کیا جائے تو اس کا نتیجہ بجز اس کے کیا ہوگا کہ خود قرآن نقل متواتر کے باوجود معرض شک و شبہ ہو جائے اور ظاہر ہے اس کو منکرین

حدیث بھی برداشت نہیں کر سکتے! فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهَا يُؤْمِنُونَ۔
چنانچہ حافظ ابن صلاح فرماتے ہیں۔

ثم ان الامم مجمعة على تعديل بھرامت کا تمام صحابہ کی تعدیل پر اتفاق
جميع الصحابة ومن لا بس ہے اور جو صحابہ فتنوں کے ساتھ دوچار ہوئے
الفتن منهم فكذلك ہیں وہ بھی ان میں سے ہی ہیں۔ اور یہ
باجماع العلماء الذين يعتد فیصلہ صحابہ کے ساتھ حسن ظن اور ان کے
بهم في الاجماع احسانا للظن فضائل و مکارم کو پیش نظر رکھنے کی وجہ
بهم ونظرا الى ما تمهد لهم سے ہے۔ اور چونکہ یہ مقدس حضرات
من المآثر وكان الله سبحانه شریعت کے نقل کرنے والے ہیں اس لئے
وتعالى اتاح الاجماع على اللہ تعالیٰ نے گویا ان کی عدالت پر امت
ذالك لكونهم نقلت الشريعة۔ کا اجماع مقرر کر دیا۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں۔

”سلف امت اور جمہور خلف کا اس پر اتفاق ہے کہ صحابہ کی عدالت اس لئے ثابت ہے
کہ خود اللہ نے ان کی تعدیل اور ان پر ثنا کی ہے۔ پس یہی ہمارا اعتقاد ہے“
یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مواقع پر صحابہ کے کسی فعل پر نکتہ
چینی کرنے اور ان میں سے کسی کی شان میں گستاخانہ کلمات کہنے کی سخت ممانعت فرمائی
ہے۔ جمعہ کے خطبہ میں بارہا سنا ہوگا۔

اللہ اللہ فی اصحابی تم میرے اصحاب کے متعلق کچھ کہتے ہوئے
لا تتخذوهم من بعدی اللہ سے ڈرو، ان کو میرے بعد نشانہ
غرضاً۔ نہ بناؤ۔

۱۴ مقدمہ ابن صلاح ص ۲۶۰ سے المستصفیٰ جز ۱ ص ۱۶۵

عدالت سے مراد | لیکن یہاں اس امر کی تصریح کر دینی ضروری ہے کہ صحابہ کی عدالت سے مراد کیا ہے؟ اصل یہ ہے کہ اصول حدیث کی اصطلاح میں عدالت کے معنی جھوٹ نہ بولنا ہیں۔ پس ہم صحابہ کو جو عادل کہتے ہیں تو اس سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ وہ بے گناہ اور معصوم ہیں بلکہ مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی کی طرف کذب کا انتساب نہیں کیا جاسکتا یعنی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کسی صحابی نے عمداً و قصداً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی ایسی بات منسوب کی ہے جو آپ نے نہیں فرمائی۔ اس کا دعویٰ کسی محدث نے نہیں کیا کہ صحابہ انبیاء کی طرح معصوم ہیں اور ان سے احتیاط و تقویٰ کے خلاف کوئی فعل صادر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ علامہ ابن ابیاری کا قول ہے۔

لیس المراد بعد التہم ثبوت صحابہ کی عدالت سے یہ مراد نہیں ہے کہ صحابہ
العصمة لهم واستحالة المعصية بالکل معصوم ہیں اور ان سے معصیتوں کا صادر
منہم وانما المراد قبول روایاتہم ہونا محال ہے بلکہ مراد صرف یہ ہے کہ اسباب
من غیر تکلف البحث عن اسباب عدالت اور تزکیہ کی طلب سے متعلق بحث کے
العدالت و طلب التزکیۃ الا بغیر انکی روایتیں قبول کی جائیں گی مگر ہاں اس
ان یثبت ارتکاب قاذح ولم صورت میں جبکہ کسی امر قاذح کے ارتکاب کا
یثبت ذالک لہ ثبوت بہم پہنچ جائے اور یہ ثابت نہیں ہے۔

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں:-

”اہل سنت کا یہ ثابت و مسلم عقیدہ ہے کہ صحابہ کل کے کل عادل ہیں۔ یہ لفظ بار بار
بولایا ہے اور میرے والد مرحوم (شاہ ولی اللہ محدث دہلوی) نے اس لفظ کی حقیقت
سے بحث کی تو یہ ثابت ہوا کہ اس موقع پر عدالت کے متداول معنی مراد نہیں ہیں بلکہ
صرف عدالت فی روایت الحدیث مراد ہے۔ اس کے سوا اور کچھ مراد نہیں ہے اور

لہ ارشاد الفحول للشوکانی ص ۶۷ بحوالہ اسوۃ صحابہ۔ دار المصنفین اعظم گڑھ

اس عدالت کی حقیقت روایات میں جھوٹ بولنے سے بچنا ہے کیونکہ ہم نے تمام صحابہؓ کی سیرت کو خوب ٹولا یہاں تک کہ ان لوگوں کی سیرت کا بھی مطالعہ کیا جو خانہ جنگیوں، فتنوں اور لڑائی جھگڑوں میں شریک ہوئے تو معلوم ہوا کہ وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت دروغ بیانی کو سخت ترین گناہ سمجھتے تھے اور اس سے شدت کے ساتھ احتراز کرتے تھے۔ لہ

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے یہ خوب فرمایا کہ جو صحابہؓ خانہ جنگیوں میں مبتلا تھے ان کی سیرت کی اچھی طرح سے جانچ پڑتال کی گئی تو معلوم ہوا کہ روایت میں کذب بیانی سے کام اٹھانے نے بھی نہیں لیا اس کا اندازہ اس ایک بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ احادیث متواترہ کی تعداد محدثین کے نزدیک بہت ہی کم ہے اور ان ہی میں حدیث من کذب علی متعمداً فیتبوا مقعدہ من النار بھی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صحابہ کرام میں اس حدیث کو قرآن کی طرح شہرت حاصل تھی اور وہ کذب فی روایت الحدیث سے کس درجہ خوف کھاتے تھے۔

عدالت کے معنی کی اس تنقیح کے بعد یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اگر ہم تمام صحابہ کو عادل مانتے ہیں یعنی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان میں سے کسی نے روایت میں کذب بیانی سے کام نہیں لیا تو اس میں کوئی بات "غیر صحیح اور قرآن کے خلاف نہیں ہے" اور نہ ہمارا یہ فیصلہ محض عقیدہ تندی کا فیصلہ ہے۔

تابعین کا دور

صحابہ کرام کے بعد تابعین عظام کا دور آیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ کرام مختلف شہروں میں متفرق ہو گئے تھے اور اپنے اپنے مقام پر قرآن و حدیث کی تعلیم دیتے تھے۔ مکہ، مدینہ، شام، بصرہ، کوفہ، یمن اور مصر، ان سب مقامات پر تعلیم قرآن و حدیث کی مستقل درسگاہیں قائم تھیں۔

مدینہ ان سب میں مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ اکابر صحابہ مثلاً حضرت عمرؓ، زید بن ثابتؓ، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم یہیں تشریف فرما تھے، مکہ میں حضرت معاذ بن جبلؓ، کوفہ میں حضرت علیؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ۔ بصرہ میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور انس بن مالکؓ۔ شام میں حضرت معاذ بن عبادہ بن الصامتؓ اور حضرت ابوالدرداءؓ۔ مصر میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ علم و فضل کے جو اہل تارہے تھے۔ ان کی درسگاہ فیض و ارشاد سے بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے جن پر اسلامی علوم و فنون کو رہتی دنیا تک ناز رہے گا۔

یہی تابعین کرام ہیں جو صحابہ کرام کے علم کے صحیح وارث ہوئے انھوں نے بکمال مشقت اور بغایت محنت و جستجو قرآن و حدیث کا علم حاصل کیا اور اس میں ہمارے ساتھ تا تمہ پیدا کر کے اس کو محفوظ و مضبوط بنیادوں پر قائم کر دیا۔ تابعین کرام کے مختلف طبقات ہیں علامہ ابن سعد نے طبقات میں پہلے شہر کے لحاظ سے ان کی تقسیم کی ہے۔ پھر ایک شہر کے تابعین میں ثقاہت و عدالت کے لحاظ سے متعدد طبقات قائم کئے ہیں اور ہر طبقہ کے حالات بڑی محنت و جستجو اور تلاش و تحقیق سے جمع کئے ہیں۔

تابعین مدینہ کے طبقہ اولیٰ میں سب سے زیادہ نمایاں اور مشہور شخصیت حضرت امام محمد بن مسلم معروف بہ ابن شہاب زہری کی ہے۔ صحابہ کے بعد علوم قرآن و حدیث کی نشر و اشاعت جن بزرگوں کی کوششوں کی رہین منت ہے امام زہری کا نام ان کے سرفہرست ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی علمی کوششوں کا تذکرہ مختصراً کر دیا جائے۔

امام زہری آپ کا نام محمد تھا اور ابو بکر کنیت۔ والد کا نام مسلم تھا۔ ان کے پرورداد عبداللہ بن شہاب زعمائے قریش میں سے تھے۔ انھیں کی نسبت سے امام زہری ابن شہاب کہلاتے ہیں۔ ۱۲۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۴ھ میں وفات پائی۔ امام زہری میں تحصیل علم کی استعداد فطری تھی۔ ذہانت و ذکاوت میں سب سے زیادہ نمایاں تھے۔ قوت حافظہ غیر معمولی رکھتے تھے۔ اسی دن میں پورا کلام مجید حفظ کر لیا تھا۔ تمام عمر میں صرف ایک مرتبہ ایک حدیث میں کچھ شبہ ہوا تھا لیکن تحقیق سے معلوم ہوا کہ جس طرح انھیں یاد تھی وہ حدیث ویسی ہی تھی۔ اس غیر معمولی ذہانت و قوت حافظہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے علم کا ذوق جستجو بھی ایسا ہی مرحمت فرمایا تھا۔ اسی طلب میں آٹھ سال تک حضرت سعید بن المسیبؓ کی خدمت میں رہے۔ ابوالزناد کہتے ہیں "ہم علماء کے پاس زہری کے ساتھ جاتے تھے، ان کے پاس تختیاں اور صحیفے ہوتے تھے۔ جن میں وہ جو حدیث سنتے تھے لکھتے جاتے تھے۔ امام زہری کا ذوق کسی ایک علم و فن تک محدود نہ تھا بلکہ قرآن، حدیث، تاریخ، اور انساب عرب، ان میں سے وہ ہر ایک کا ذوق رکھتے تھے۔"

ابوصالح لیث سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے زہری سے زیادہ کسی کو جامع علوم و فنون نہیں دیکھا وہ ترغیب کی حدیثیں بیان کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ اس سے زیادہ کچھ اور نہ جانتے ہوں گے۔ پھر عرب اور انساب کے متعلق بیان کرنے لگتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سب سے بہتر وہ اسی کو جانتے ہیں پھر اگر قرآن و حدیث بیان کرنے پر آجاتے تو اس میں

بھی ایسی ہی مہارت دکھاتے تھے۔ ۱۵

کتابت حدیث | امام زہریؒ کا حافظہ اگرچہ نہایت قوی تھا لیکن ازراہ احتیاط وہ پھر بھی احادیث قلمبند کرتے تھے۔ صالح بن کیسان کا بیان ہے کہ میں تحصیل علم میں زہری کے ساتھ رہتا تھا انھوں نے مجھ سے کہا کہ سنن قلمبند کر لینی چاہئے۔ چنانچہ ہم نے تمام سنن لکھ لیں۔ سنن رسول اللہ کو لکھ لینے کے بعد انھوں نے کہا کہ اب سنن صحابہ لکھ لینی چاہئے لیکن ہم نے ان سنن کو نہیں لکھا اور زہری نے لکھ لیا۔ ۱۶

بعض محدثین کے بیانات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے حکم سے سب سے پہلے امام زہریؒ نے احادیث کی تدوین کی تھی۔ یہ بیان صحیح ہو یا نہ ہو، یہ بہر حال یقینی ہے کہ امام زہریؒ نے احادیث کا ایک ضخیم مجموعہ تیار کیا تھا۔ امام شافعیؒ فرماتے تھے "اگر زہری نہ ہوتے تو دینہ کے سنن ضائع ہو جاتے۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ فرماتے تھے اب سنت ماضیہ کا جاننے والا زہریؒ سے زیادہ کوئی نہیں ہے۔ اسی قسم کا مقولہ حضرت کحول سے بھی مروی ہے۔ ایوب السخیتی فرماتے تھے ما رأیت اعلیٰ من الزہری۔ ۱۷

حفظ احادیث | امام زہریؒ چونکہ کثرت سے روایت کرتے تھے اس لئے بعض لوگوں کو ان پر شبہ ہوتا تھا لیکن جب کبھی ان کا امتحان لیا گیا۔ تمام شکوک و شبہات کا پردہ خود بخود چاک ہو گیا۔

ایک مرتبہ ہشام بن عبد الملک نے اپنے کسی لڑکے کے واسطے ان سے حدیثیں قلمبند کرنے کی درخواست کی۔ آپ نے چار سو حدیثیں لکھ دیں۔ ایک ماہ کے بعد ہشام نے امتحان کیا کہ وہ مجموعہ گم ہو گیا۔ امام زہریؒ نے وہی احادیث پھر لکھوا دیں۔ دونوں کو بلا کر دیکھا

۱۵ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۳ ۱۶ تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۲۲۸۔ ۱۷ مقدمہ فتح الملہم شرح مسلم ص ۹۲
۱۸ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۳۔ ۱۹ ایضاً۔

گیا تو ایک حرف کا بھی فرق نہیں تھا۔ ۱۵

مرویات کی تعداد | احادیث و سنن کا نہ معلوم کتنا ذخیرہ ان کے سینہ میں ہوگا۔ ان سے جو روایتیں مروی ہیں ان کی تعداد دو ہزار سے زیادہ ہے۔ پھر کیفیت و نوعیت اور ان کا پایہ

کے اعتبار سے دیکھے تو ان کا پایہ بہت ہی اعلیٰ ہے۔ عمر بن دینار جو خود جلیل القدر محدث تھے فرماتے تھے: "میں نے زہری سے زیادہ کسی کو حدیث میں قطعی فیصلہ کرنے والا نہیں دیکھا۔" امام احمد بن حنبلؒ اور اسحاق بن راہویہ فرماتے ہیں: "زہری کی وہ روایات اصح الاسانید ہیں جو انھوں نے سالم سے اور سالم نے اپنے والد عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہیں۔" ۱۶

شیوخ | امام زہری نے جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے۔ طلب علم میں ہر چشمہ فضل و کمال سے سیراب ہونے کی کوشش کی تھی اس لئے ان کے شیوخ کا دائرہ بہت وسیع ہے جس میں چند فاضلہ خواتین بھی شامل ہیں۔ صحابہ میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ، عبد اللہ بن جعفرؓ، ربیعہ بن عبادؓ، مسور بن مخرمہؓ، انس بن مالکؓ، سہل بن سعدؓ، سائب بن زیدؓ، شیبؓ، ابو جمیلہؓ، عبد الرحمن بن ازہرؓ، محمود بن ربیعؓ، عبد اللہ بن ثعلبہؓ، عبد اللہ بن عامرؓ، ابوامامہؓ، سعد بن سہل اور ابوالطفیلؓ اور اکابر تابعین میں حضرت سعید بن المسیبؓ، شعبیؓ، حسن بصریؓ اور مکحولؓ۔ امام زہریؒ جتنے بڑے محدث تھے فقیہ و مفتی بھی تھے چنانچہ ان کی وفات کے بعد محمد بن نوح نے ان کے فتاویٰ جمع کئے تو تین جلدوں میں آئے۔ ۱۷

امام زہریؒ کے علاوہ اس عہد کے ائمہ حدیث جن کو سنن و آثار کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے حضرت نافع، اعش اور قتادہ ہیں۔ امام زہریؒ کے تلامذہ پانچ طبقات پر منقسم ہیں۔ ان طبقات میں سے ہر طبقہ اپنے ماتحت طبقہ پر فضیلت رکھتا ہے۔ پہلے طبقہ میں وہ

۱۵ تذکرۃ الحفاظ ص ۱۰۳ و ۱۰۴۔ ۱۶ تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۲۸۔ ۱۷ تہذیب الاسما واللغات ج ۱ ص ۹۱

۱۸ اعلام الموقعین ج ۱ ص ۲۶۔

حضرات داخل ہیں جو عدالت، ثقاہت، اتقان اور حفظ میں سب سے ممتاز ہیں اور اس کے ساتھ ہی اپنے شیخ کی طویل ملازمت و مصاحبت کا شرف رکھتے ہیں۔ دوسرے طبقہ میں وہ لوگ شامل ہیں جو عدالت اور ثقاہت میں طبقہ اولیٰ کے برابر ہیں۔ لیکن انھیں شیخ کی مصاحبت ان لوگوں کے برابر نصیب نہیں ہوئی۔ تیسرے طبقہ میں وہ بزرگ داخل ہیں جنہوں نے شیخ کی ملازمت تو پہلے طبقہ کے برابر کی ہے۔ لیکن وہ مفسدہ جرم سے پاک نہیں، طبقہ چہارم کا اطلاق اس جماعت پر ہوتا ہے۔ جس کے افراد طبقہ ثالثہ کے ساتھ جرح و تعدیل میں شریک ہیں اور اس کے ساتھ ملازمت شیخ بھی کچھ زیادہ طویل نہیں رکھتے۔ پانچواں طبقہ صنعفار اور مجہول روایہ کا ہے

ان روایہ میں مرتبہ اور درجہ کے لحاظ سے جو فرق ہے۔ اسی کے اعتبار سے ان کی روایتوں کے قبول و عدم قبول سے متعلق تشدد اختیار کیا گیا ہے۔ طبقہ اولیٰ کے لوگ چونکہ سب سے اعلیٰ اور افضل ہیں اس لئے امام بخاری صرف انہی کو مستند قرار دیتے ہیں اور ان ہی کی روایات پر اعتماد کرتے ہیں۔ کبھی کبھی طبقہ ثانیہ کے روایہ کی کوئی حدیث جس کی صحت کا ان کو یقین ہوتا ہے اسے بھی لے آتے ہیں۔ البتہ دوسرا طبقہ امام مسلم کی شرط پر ہے۔ طبقہ ثالثہ کے روایہ امام ابوداؤد اور نسائی کی شرط پر ہیں۔ طبقہ رابعہ کے حضرات امام ابو عیسیٰ ترمذی کی شرط پر ہیں۔ پانچواں طبقہ مجہولین کا ہے اس لئے امام ابوداؤد کے نزدیک جو شخص ابواب کے ماتحت احادیث کی تخریج کرتا ہے اس کے لئے ان کی حدیث لینا جائز نہیں ہے۔ البتہ اگر اس کو دوسرے ذرائع سے اعتماد حاصل ہو جائے تو پھر اس روایت کے قبول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

امام زہری اور ان کے معاصر ائمہ حدیث جن کے تراجم اور علمی کوششوں کے ذکر کا۔۔۔ یہاں موقع نہیں ہے۔ انھوں نے اقوال و افعال نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی حفاظت اور ان کی نشر و اشاعت میں صحابہ کرام کی صحیح جانشینی کا پورا پورا حق ادا کیا۔

پھر ان کے تلامذہ نے اپنے اساتذہ کے مسندِ درس و علم کو سنبھالا تو تاریخ گواہ ہے کہ انھوں نے بھی اس ورثہ علمی کی حفاظت، تنقیح و تحقیق اور اس کی اشاعت و توسیع میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور اس کو ہر امکانی کوشش کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ محفوظ و مامون کر دیا۔ یہ سلسلہ تدریس کے دور تک برابر جاری رہا۔

تیسری صدی ہجری میں جب "دورِ تدریس" کا آغاز ہوا تو اس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اب تک احادیث فقہ سے الگ نہیں تھیں اور اسی بنا پر لوگ سنت کے ساتھ اقوال صحابہ کو بھی ملائے رکھتے تھے۔ لیکن اب خیر القرون کے ختم ہونے کے بعد ضرورت محسوس ہوئی کہ حدیث کو بحیثیت ایک فن کے مدون کیا جائے۔ تو اقوال صحابہ کو سنت سے خارج قرار دیا گیا اور خود حدیث کی صحت معلوم کرنے کے لئے روایت کے قبول و عدم قبول کا معیار باقاعدہ طور پر مقرر کیا گیا۔ راویوں کا ایک ایک حال بڑی محنت و کوشش سے معلوم کیا۔ اسباب جرح و تعدیل کی تعیین ہوئی۔ حدیث کی متعدد قسمیں کی گئیں اور ان سب امور کی تکمیل کے لئے متعدد علوم و فنون مدون ہوئے جن کے حصار میں آج علم حدیث ہر قسم کے شکوک و شبہات سے دور نہایت مضبوط بنیادوں پر قائم ہے۔

اسناد صحابہ کرام کے عہد میں کسی روایت کی توثیق کا قاعدہ یہ تھا کہ راوی سے شہادت طلب کی جاتی تھی۔ تابعین کے عہد میں صرف شہادت کافی نہیں ہو سکتی تھی اس لئے اسناد کا سلسلہ قائم کیا گیا۔ یعنی جب کوئی راوی روایت بیان کرتا تھا تو اسے بتانا پڑتا تھا کہ اس نے وہ روایت کس سے سنی ہے اور اس نے کس سے سنی تھی یہاں تک کہ وہ سلسلہ صحابی تک پہنچ جاتا تھا بڑے بڑے ائمہ اس کا التزام کرتے تھے۔

ایک مرتبہ امام زہریؒ جن کی فراست و ثقاہت میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا انھوں نے حضرت سفیان بن عیینہؒ سے ایک حدیث بیان کی اور اس کے ساتھ اسناد بھی بیان کرنی شروع کی تو سفیان بولے "آپ سندرہ بنے دیجئے" امام زہریؒ نے فرمایا "کیا آپ بغیر سیڑھی کے

حجت پر چڑھنا چاہتے ہیں۔^۱

تاہم معلوم ہوتا ہے کہ تابعین کے دورِ اولین میں اسناد کا عام طور پر زیادہ اہتمام نہیں کیا جاتا تھا۔ لیکن جب طرح طرح کے فرقے پیدا ہو گئے اور بعض شریر النفس لوگوں نے اپنے عقائد باطلہ کو ثابت کرنے کے لئے احادیث وضع کرنی شروع کیں تو سند حدیث کی روایت کے لئے ایک لازمی اور اہم شرط قرار دیدی گئی۔ محمد بن سیرین کا قول تھا۔

ان هذا العلم دين فانظروا
 على علم دين به تم دیکھو کہ اپنے دین کو کس سے
 عنتم تاخذون دينکم
 حاصل کر رہے ہو۔

پھر فرماتے ہیں۔

لم يكنوا يسئلون عن الاسناد
 فلما وقعت الفتنة قالوا
 سموا النار جالكم فينظروا
 اهل السنة فيؤخذ حدثهم
 وينظر الى اهل البدع
 فلا يؤخذ حد يثممه
 پہلے لوگوں سے اسناد کے متعلق سوال نہیں کیا جاتا تھا۔ پھر جب فتنہ واقع ہو گیا تو محدثین نے کہا ہم سے اپنے راویوں کے نام بیان کرو تا کہ یہ دیکھا جائے کہ وہ اہل سنت میں سے ہیں یا نہیں اگر ہیں تو ان کی حدیث قبول کر لی جائے اور اگر وہ اہل بدعت میں سے ہیں تو ان کی حدیث ترک کر دی جائے۔

حضرت سفیان ثوری فرماتے تھے۔

”راویوں نے جھوٹ کی آمیزش شروع کر دی تو ہم نے تاریخ سے کام لینا شروع کر دیا۔“
 حسان بن زید کہتے ہیں۔

”کذابین کی تاریخ سے بڑھکر ہمارا کوئی مددگار نہیں ہے۔ میں شیخ سے اس کا سن دریافت کرتا ہوں اس کی تاریخ پیدائش پوچھتا ہوں اگر وہ سچ بتا دیتا ہے تو ہم اس کے صدق و کذب میں تمیز کر لیتے ہیں۔“

۱۔ تدریب الراوی ۱۷۷ مقدمہ صحیح مسلم۔

حسن بن الربیع کہتے ہیں۔

”ایک بار میں بغداد گیا۔ جب واپس ہونے لگا تو اصحابِ حدیث دوڑتے میری

مشابعت کو آئے۔ میں باہر پہنچا تو انھوں نے کہا ذرا ٹھہر جائیے احمد بن حنبل آ رہے

ہیں۔ میں بیٹھ گیا۔ جب وہ آئے تو مجھ سے پوچھا کہ عبداللہ بن مبارک کا کس سنہ میں

انتقال ہوا تھا؟ میں نے کہا ۸۱ھ میں۔ جب امام احمد بن حنبل سے دریافت کیا گیا کہ

آپ کا اس سوال سے کیا مطلب تھا؟ تو فرمایا ”میں کذابین کی شناخت اسی طرح کرتا ہوں“

اسناد کی اہمیت | اسناد کو علمِ حدیث میں جو اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ

عبداللہ بن مبارک فرماتے تھے ”اسناد دین کا جزو ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو جس کے جی میں جو آتا

کہہ گذرتا“ ۱۷

علامہ ابن صلاح لکھتے ہیں ”اصل اسناد اس امت کے خصائص میں سے ہے اور سنن

موکدہ میں سے ایک بہت بڑی سنت ہے“ ائمہ حدیث کو اسنادِ عالی کی طلب اتنی ہوتی تھی

کہ نفس واپس کے وقت بھی جبکہ انسان دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوتا ہے اسے فراموش

نہیں کرتے تھے۔ یحییٰ بن معین کا انتقال ہونے لگا تو کسی نے ان سے پوچھا۔ اس وقت

آپ کی تمنا کیا ہے؟ فرمایا ”ایک تنہا مکان اور ایک عالی اسناد“ محمد بن اسلم الطوسی نے

کہا ہے ”اسناد کا قرب گویا کہ اللہ کا قرب ہے“ قرآن مجید میں جو ایک مقام پر ”او انارة

من علم“ آیا ہے حاکم وغیرہ نے مطر الوراق سے نقل کیا ہے کہ اس کا مصداق علمِ اسناد

الحدیث ہے“ ۱۸

جس روایت کا سلسلہ ثقہ راویوں کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہنچتا

تھا اسے درجہ قبول حاصل نہیں ہوتا تھا۔ ابواسحاق ابراہیم بن عیسیٰ بیان کرتے ہیں۔

”ایک مرتبہ میں نے عبداللہ بن مبارک سے ایک حدیث ان من البر بعد البران

تصلی لا بویک مع صلواتک و تصوم لہما مع صومک کی نسبت دریافت کیا
 تو انھوں نے پوچھا "تم نے یہ حدیث کس سے سنی ہے؟" میں نے کہا "شہاب بن
 خراش سے" فرمایا "وہ تو ثقہ ہیں اور شہاب نے کس سے سنی ہے؟" میں نے کہا "حجاج
 بن دینار سے" فرمایا "وہ بھی ثقہ ہیں لیکن انھوں نے کس سے سنی ہے؟" میں نے کہا
 "وہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں" عبداللہ بن مبارک نے یہ
 سُنکر کہا "اے ابواسحاق حجاج بن دینار اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان
 تو بڑے بڑے جنگل ہیں جن میں اونٹنیوں کی گردنیں ٹوٹ جاتی ہیں۔" ۱۷

اسما الرجال کی تدوین | اس علم اسناد الحدیث کی وجہ سے ہی رواد حدیث کے حالات و سوانح
 کی چھان بین کی گئی، ان کے اخلاق و اعمال کے ایک ایک گوشہ کی بجمال احتیاط و دیرہ وری
 تحقیق و تفتیش کی گئی۔ جس سے "اسما الرجال" کا وہ عظیم الشان فن مدون ہو گیا جس کی نظیر کسی
 قوم کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ جرمنی کے مشہور فاضل مستشرق ڈاکٹر اسپرنگر جنھوں نے حافظ
 ابن حجر کی کتاب کی تصحیح کی ہے اصحاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

"نہ کوئی قوم دنیا میں ایسی گذری نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسما الرجال کا
 عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو، جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔"

محدثین نے اس کٹھن راہ میں جس انتہائی جفاکشی، دیانت داری اور صلاح و تقویٰ کا
 ثبوت دیا ہے، بے شبہ اس کو اسلام کا ایک معجزہ کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے جرح و تعدیل کا
 جو معیار مقرر کیا تھا اس پر بادشاہوں سے لیکر بڑے سے بڑے ائمہ مذہب کو پرکھا۔ اور اس راہ
 میں نہ ان کو کوئی دنیوی طاقت و حشمت مرعوب کر سکی اور نہ وہ کسی کی مذہبی قیادت و پیشوائی
 سے خوفزدہ ہوئے۔ جس شخص میں کوئی ذرا سا نقص بھی دیکھا اس کو بر بلا اور علی الاعلان کہا کہ

۱۷ مقدمہ صحیح مسلم باب الکشف عن معائب رواد الحدیث۔ ۱۷

۱۸ بحوالہ سیرت النبی ج ۱ ص ۳۵۔ یہ حوالہ پہلے بھی ایک جگہ گزر چکا ہے۔

لوگ اس کی روایتیں قبول کرنے میں احتیاط برتیں۔ علی بن شقیق کہتے ہیں "میں نے ایک مرتبہ عبداللہ بن مبارک کو دیکھا کہ ایک بھرے مجمع میں کہہ رہے تھے۔

"لوگو! عمرو بن ثابت کی حدیثیں مت قبول کرو یہ سلف کی شان میں گستاخیاں کرتا ہے"

یحییٰ بن سعید کہتے ہیں۔

"میں نے حضرت سفیان ثوری، شعبہ، مالک اور ابن عیینہ سے پوچھا کہ اگر ایک شخص

حدیث میں لائق اعتماد نہ ہو اور مجھ سے کوئی شخص اس کے متعلق دریافت کرے تو

میں کیا کہوں؟ سب نے بالاتفاق کہا "تم صاف صاف کہو کہ وہ لائق اعتبار نہیں ہے"

امام مسلم نے اپنی صحیح کے مقدمہ میں ایک فصل کے ماتحت اس پر مفصل کلام کیا ہے

اور علماء و محدثین کے اقوال سے ثابت کر دیا ہے کہ اگر کسی شخص کے متعلق کوئی ذرا سا شبہ بھی ہو تو

اس کی حدیث قبول نہ کرنی چاہئے اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کا اعلان عام کر کے لوگوں کو

اس کے فتنہ و شر سے بچانے کی کوشش بھی کرنی چاہئے۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ اس سلسلہ میں کسی کے تدین اور تشریح کو بھی تثبت فی روایت

الحدیث کا معیار قرار نہیں دیا گیا۔ امام یحییٰ بن سعید القطان جو فن جرح و تعدیل کے بے نظیر

امام ہیں ان کا قول پہلے گزر چکا ہے۔

لمنز الصالحین فی شئی اکذب صاحبین کسی چیز میں اتنا جھوٹ نہیں بولتے

منہدی فی الحدیث ۵۲ جتنا کہ وہ حدیث میں بولتے ہیں۔

امام مسلم اس کی توجیہ یہ کرتے ہیں کہ یہ لوگ عمدًا جھوٹ نہیں بولتے بلکہ ان کی زبان سے

خلاف واقعہ الفاظ نکل جاتے ہیں۔

معن بن عیینہ بیان کرتے ہیں کہ امام مالک فرماتے تھے "چار شخصوں کی حدیث بالکل

نہ قبول کی جائے، ایک بے وقوف کی، دوسرے اس شخص کی جو اپنی خواہشات کا بندہ ہو اور

۱۵۳ مقدمہ صحیح مسلم ۵۲ و ۵۳ ایضاً

لوگوں کو ان کی دعوت دیتا ہو، تیسرے اس شخص کی جو جھوٹا ہو اور اگرچہ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کذب بیانی کا ثبوت نہ پہنچا ہو، لیکن لوگوں کی بات چیت میں جھوٹ سے احتراز نہ کرتا ہو۔ اور چوتھے اس صاحب فضل و عبادت اور صاحب صلاح و تقویٰ کی حدیث بھی قبول نہ کی جائے جو اس حدیث کو جانتا ہی نہ ہو جسے وہ بیان کرتا ہے۔

محدثین کو کسی کے متعلق اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ یہ شخص روایت کے قبول کرنے میں راوی کی جانچ پڑتال اور اس کے حالات کی تحقیق نہیں کرتا تو وہ اس کو بھی خواہ وہ اپنی ذات سے کیسا ہی راست گفتار ہوتا قابل اعتبار قرار دیتے تھے۔ عبد اللہ بن مبارک نے ایک راوی بقیۃ کی نسبت فرمایا۔

صدوق اللسان ولكن يأخذ

زبان کا سچا ہے۔ لیکن وہ ہر کہ و مہ کی

عمن اقبل او ادبر لہ

روایت قبول کرتا ہے۔

اسرار الرجال کی کتابیں | محدثین نے اس فن کو اس درجہ ترقی دی کہ روادے کے احوال میں بڑی بڑی ضخیم کتابیں تصنیف کیں۔ پھر جو راوی ضعیف یا مجہول تھے ان کے احوال میں الگ، اور جو معتبر و ثقہ تھے ان کے حالات میں الگ کتابیں لکھیں۔
مولانا شبلیؒ لکھتے ہیں:

”سب سے پہلے اس فن یعنی راویوں کی جرح و تعدیل میں یحییٰ بن سعید القطان نے ایک کتاب لکھی وہ اس مرتبہ کے شخص تھے کہ امام احمد بن حنبل نے ان کی نسبت لکھا ہے کہ میری آنکھوں نے ان کا نظیر نہیں دیکھا۔ ان کے بعد اس فن کو زیادہ رواج ہوا اور کثرت سے کتابیں لکھی گئیں جن میں سے چند ممتاز تصنیفات حسب ذیل ہیں۔

کیفیت	نام مصنف
خاص ضعیف الروایت لوگوں کے حال میں ہے اس کتاب کا نام کتاب الجرح والتعدیل ہے۔ بہت ضخیم کتاب ہے۔	رجال عقیلی ۱۷ رجال احمد بن عبد العجلی متوفی ۲۶۱ھ رجال امام عبد الرحمن بن حاتم الرازی المتوفی ۳۲۴ھ
مشہور محدث ہیں یہ کتاب خاص ضعیف الروایت اشخاص کے حال میں ہے۔	رجال امام دارقطنی
اس فن کی سب سے مشہور کتاب ہے اور تمام محدثین متاخرین نے اس کو اپنا ماخذ بنایا ہے۔	کامل ابن عدی ۱۷

مولانا شبلی لکھتے ہیں یہ کتابیں آج نہیں ملتیں لیکن بعد کی تصنیفات جو ان ہی سے

مانحہ ہیں وہ دستیاب ہوتی ہیں ان میں زیادہ مشہور یہ ہیں۔

تہذیب الکمال - تہذیب التہذیب، لسان المیزان - تقریب - تاریخ کبیر بخاری -
تاریخ صغیر بخاری (چھپ گئی) ثقات ابن جان (قلمی) تذکرۃ الحفاظ - مشتبہ النسب (قلمی) انساب معانی
تہذیب الاسماء واللغات - میزان الاعتدال - کتاب الاسماء والکنیٰ -

ظاہر ہے کہ ایک روایت کے تمام راویوں کے متعلق ایک ایک جزئی کو معلوم کرنا
سخت مشکل کام تھا لیکن یہ قول علامہ شبلی اس کام کے لئے سینکڑوں ہزاروں محدثین نے
اپنی عمریں صرف کر دیں، ایک ایک شہر میں گئے، راویوں سے ملے، ان کے متعلق ہر قسم کے
معلومات بہم پہنچائے، جو لوگ ان کے زمانہ میں موجود نہ تھے ان کے دیکھنے والوں سے حالات
دریافت کئے۔

۱۷ کتب خانہ آصفیہ میں اس کا نسخہ موجود ہے۔ ۱۸ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن سے شائع ہوگی۔

۱۹ دارالکتب المصریہ میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے۔

راویوں کے مختلف حالات اور بعض دوسرے امور کی وجہ سے ہی احادیث کی متعدد
قسمیں قرار دی گئیں اور ان کو صحیح و ضعیف وغیرہ پر تقسیم کیا گیا۔ ہم صرف حدیث صحیح کی تعریف
بیان کریں گے اور باقی اقسام کا ذکر اسی ضمن میں آجائے گا۔

حدیث صحیح | محدثین کے نزدیک صحیح حدیث وہ ہے۔ جس کی اسناد راوی سے لیکر آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل ہو یعنی درمیان میں سے منقطع یا مرسل نہ ہو، اور اس کو ایک
ایسے شخص نے نقل کیا ہو جو عادل ہو، ضابط ہو، اور جس میں کسی قسم کا شد و ذیاعلت نہ پائی جاتی ہو۔
عدالت | عدالت کی تعریف میں اختلاف ہے۔ چنانچہ علامہ طاہر الجزائری فرماتے ہیں "تمام
چیزوں میں سب سے زیادہ مشکل عدالت کو پہچاننا ہے" امام غزالی "مستصفیٰ میں فرماتے ہیں۔
"عدالت ایک ایسا ملک ہے جس کے ذریعہ انسان کبائر کے ارتکاب اور صغائر پر اصرار سے
اجتناب کرتا ہے" بعضوں نے یہ بھی کہا ہے کہ عدالت کبائر اور صغائر دونوں سے باز رکھتی
ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ "جس شخص میں مروت اور طاعت غالب ہو وہ عادل ہے" ان تعریفوں
کی بنا پر ایک وہ شخص جو کوئی ایسی حرکت کرتا ہے جس سے اس کے دین کی رکاکت پر استدلال
کیا جاسکتا ہو مثلاً بازار میں کھانا، بازار میں پیشاب کرنا۔ عام لوگوں کے ساتھ ہنسی اور ٹھٹھول
کرنا، اس کو پایہ عدالت سے ساقط سمجھا جائے گا۔

حافظ ابن تیمیہ نے سب سے الگ ایک نئی بات کہی ہے وہ فرماتے ہیں:-

"عدالت ہر زمانہ اور مکان میں اور ہر قوم میں اس کے ہی اعتبار سے ہوتی ہے۔

کیونکہ ہر قوم میں شاہد وہی ہوتا ہے جو اس کے اپنے معیار عدالت کے مطابق ہو

اسی اعتبار سے لوگوں میں سکم کرنا ممکن ہے ورنہ اگر ہر طائفہ میں شاہدوں کے لئے ادارہ

واجبات اور ترک مہرمات کی قید لگادی جائے تو تمام یا اکثر شہادتیں باطل ہو جائیں۔"

حق یہ ہے کہ امام ہمام نے بہت ہی حکیمانہ اور فریضہ کن بات کہی ہے۔ آپ کا مقصد یہ ہے کہ عدالت میں فرق ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کسی مقدمہ میں گواہی دینے کے لئے جس عدالت کی ضرورت ہے اس کا معیار اتنا سخت نہیں ہو سکتا جتنا کہ اس عدالت کا جو روایتِ حدیث کے قبول کے لئے ضروری ہے۔ اب اگر عدالت کے تمام مختلف معیاروں کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سب سے زیادہ سخت معیار اس عدالت کا ہے جو راوی حدیث کے لئے ضروری ہے۔

اسماعیل بن ابی اویس کہتے ہیں:-

”میں نے ایک مرتبہ اپنے ماموں امام مالک سے سنا فرمایا ہے تھے ”میں نے شرایسہ آدمیوں سے ملاقات کی ہے جنہوں نے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ کر (مسجد نبوی کے) ان ستونوں کے پاس حدیث بیان کی لیکن میں نے ان کی کوئی حدیث قبول نہیں کی۔ حالانکہ ان میں سے ایک ایک شخص اتنا بڑا امین تھا کہ اگر اس کو بیت المال کا انچارج بنا دیا جاتا تو وہ اس کے حق میں امین ہی ثابت ہوتا۔“

اس ایک واقعہ کی طرح کتب اسماء الرجال میں سینکڑوں واقعات مل سکتے ہیں جن سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ محدثین کے نزدیک عدالت کا جو معیار ہے وہ کس قدر سخت اور اونچا ہے۔ یہاں یہ معلوم کرنا بھی خالی از فائدہ نہ ہوگا کہ محدثین نے راوی کے لئے عدالت کی جو شرط لگائی ہے وہ خود قرآن سے مستنبط ہے ارشادِ گرامی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ
فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا لَهُ

اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی
خبر لیکر آئے تو اس کی خوب تحقیق کرو۔

ایک موقع پر ہے۔

وَ أَشْهَدُ وَ أَذْوَى عَدْلٍ
مِنْكُمْ

اپنے سے دو صاحبِ عدل انسانوں کی شہادت
پیش کرو۔

عدالت کے اعتبار سے طبقاتِ رواۃ | علامہ جزائری فرماتے ہیں "صحیح یہ ہے کہ ضبط و حفظ کی طرح عدالت بھی زیادتی اور نقصان قوت اور ضعف کو قبول کرتی ہے۔ اسی بنا پر علامہ بخسّم الدین

سلیمان الطوفی نے شرح الاربعین میں بیان کیا ہے کہ روایت کا دار و مدار راوی کے عدل و ضبط پر ہے۔ پس جو حضرات ان دونوں وصفوں میں مرتبہ اعلیٰ پر ہوں گے جیسے حضرت شعبہ، سفیان اور یحییٰ بن سعید القطان وغیرہ ان کی حدیث صحیح ہوگی۔ اور اگر راوی عادل و ضابط تو ہے لیکن مرتبہ اعلیٰ پر نہیں اس کی روایت حسن ہوگی۔ عدالت اور ضبط کے تفاوت کے اعتبار سے رواۃ کو نو طبقات پر تقسیم کیا گیا ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

ضبط | صحت حدیث کے لئے دوسری شرط ضبط ہے۔ علامہ سخاوی فرماتے ہیں :-

"ضبط کی دو قسمیں ہیں، ایک ضبط صدر، دوسرے ضبط کتاب، ضبط صدر یہ ہے کہ راوی

نے جو کچھ سنا ہے وہ سب اس کو اس طرح یاد ہو کہ جب چاہے اسے مستحضر کر سکے۔ اور ضبط

کتاب یہ ہے کہ جو سننے اُسے فوراً لکھ لے تاکہ اس میں کسی قسم کے خلل کے پیدا ہونے کا

امکان ہی باقی نہ رہے یہ ضبط کی اعلیٰ قسم ہے۔"

امام ترمذی، علل میں کہتے ہیں :-

"جو شخص حدیث کے معاملہ میں متہم بالکذب ہو اور مغفل ہو اور خطا زیادہ کرتا ہو، اکثر ائمہ

حدیث کے نزدیک ایسے شخص کے لئے یہ بات طے شدہ ہے کہ اس کی روایت پر دھیان

نہ دیا جائے۔" ۳۵

شذوذ | حدیث صحیح کی تعریف میں تیسری شرط شذوذ سے خالی ہونے کی ہے اس سے مراد

یہ ہے کہ راوی نے جو حدیث روایت کی ہے اس میں کوئی ایسا شخص اس کے مخالف نہ ہو

جو اس سے زیادہ قابلِ ترجیح ہو اور اس شذوذ کا تحقق اس وقت ہوگا جبکہ دونوں روایتوں میں

جمع کرنا مشکل ہو۔

علت | رہ گئی علت تو اس سے مراد یہ ہے کہ کوئی امر ایسا نہ پایا جائے جو صحت حدیث میں قاصر ہو، مثلاً ارسال خفی یعنی راوی کا اپنے معاصر سے لفظ عن سے روایت کرنا جس سے یہ شبہ ہو کہ راوی نے اس سے سماع کیا ہے۔ حالانکہ اسے اپنے معاصر مروی عنہ سے بالکل سماع حاصل نہ ہو یا تدلیس یعنی راوی روایت تو کرتا ہے اس شخص سے جس سے اس کو سماع حاصل ہے لیکن نقل وہ روایت کرتا ہے جو اس نے اس سے نہیں سنی اور اس انداز سے بیان کرتا ہے کہ گویا اس نے اس روایت کو خود مروی عنہ سے سنا ہے۔ علت کی دو قسمیں ہیں خفیہ اور ظاہرہ، خفیہ کی مثال اوپر گزر چکی ظاہرہ کی مثال فسق اور سوء حفظ وغیرہ ہے۔ ۱۷

حسن | حدیث کی دوسری قسم حسن ہے، اس کی تعریف عموماً یہ کی جاتی ہے کہ اس کا مخرج معلوم ہو اور رجال مشہور ہوں، مخرج معلوم ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ حدیث ایسے راوی سے مروی ہو جو اپنے شہر کے لوگوں سے روایت کرنے میں شہرت رکھتا ہو، مثلاً قتادہ اہل بصرہ سے روایت کرنے میں مشہور ہیں۔ پس اگر اہل بصرہ کی کوئی حدیث قتادہ سے مروی ہوگی تو کہا جائے گا کہ اس حدیث کا مخرج معلوم ہے۔ اس حدیث کے رواۃ بہ اعتبار ثقاہت صحیح کے رواۃ کے برابر نہیں ہوتے۔ چنانچہ علامہ ابن جوزی اس کی تعریف میں فرماتے ہیں اس حدیث میں کچھ ضعف ہوتا ہے جو احتمال کا حامل ہوتا ہے۔ لیکن اس پر کسی عمل کی بنیاد رکھنا درست ہے۔ صحیح اور حسن یہ دونوں حدیث مقبول کی قسمیں ہیں۔

اس کے بالمقابل مردود کی تین قسمیں ہیں موضوع، متروک، منکر اور ضعیف کی جس میں اسناد کے نقص کی وجہ سے ضعف ہوتا ہے چار قسمیں ہیں۔ منقطع، معضل، معلق، مرسل، پھر رواۃ کی تعداد کے اعتبار سے حدیث کی دو قسمیں ہیں متواتر اور خبر واحد، متواتر کی تعریف یہ ہے کہ اس کو ہر زمانہ میں اتنی کثیر جماعت نے نقل کیا ہو کہ ان سب کا جھوٹ بولنے پر متفق ہو جانا عاۃً محال ہو جس حدیث میں تواتر کی شرطیں نہ پائی جائیں خبر واحد کہلاتی ہے اور اس کی متعدد قسمیں ہیں۔

اسناد اور رواۃ کی تعداد اور صفات کے لحاظ سے حدیث کی اتنی قسمیں کرنا دراصل اس بات کی دلیل ہے کہ محدثین نے حدیث کی صحت و سقم معلوم کرنے کے لئے اس کے ایک ایک جز کا تجزیہ کیا، اسناد کے تمام رواۃ میں سے ایک ایک کو اچھی طرح جرح و تعدیل کی کسوٹی پر پرکھا اور الفاظ و معانی کے لحاظ سے بھی اس کے تمام پہلوؤں پر عمیق بصیرت کے ساتھ غور و خوض کیا پھر ذرا سے فرق سے ایک حدیث کو دوسری حدیث سے ممتاز کرتے چلے گئے اور اس طرح حدیث کی بہت ساری قسمیں ہو گئیں۔ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ محدثین کا جو کارنامہ انتہائی مدح و ستائش کا مستحق تھا اور یہ سب اس لئے ہی تھا کہ صحیح حدیث غیر صحیح حدیث سے بالکل ممتاز ہو جائے۔ وہی منکرین حدیث کی نظر میں معیوب و مذموم قرار دیا جاتا ہے۔ ایک صاحب لکھتے ہیں۔

انہوں (محدثین) نے احادیث پر جو احکام لگائے ہیں مثلاً قوی، صحیح، حسن، مقبول یا ضعیف، منکر، موضوع اور مردود، ان سے خود ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی یقینی فیصلہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ ورنہ روایت کی صرف دو ہی صورتیں ہیں۔ صحیح یا غلط!

سبحان اللہ!

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خسر

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

امام بخاری

یہاں تک ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ صحت حدیث کے عام معیار کی حیثیت سے تھا۔ اب ہم ان محدثین کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جنہوں نے اپنی کتاب میں اس کا التزام کیا ہے کہ وہ اعلیٰ معیار کے مطابق جو حدیث صحیح ہوگی اسی کو نقل کریں گے اس سلسلہ میں سب سے پہلا نام امام بخاری کا ہے۔

نام و نسب | آپ کا نام محمد تھا اور کنیت ابو عبد اللہ نسب یہ ہے محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ بن بردزبہ۔ آپ کے اجداد فارس کے رہنے والے مجوسی تھے۔ سب سے پہلے جو شخص ان کے خاندان میں اسلام سے مشرف ہوئے مغیرہ ہیں۔ بخارا کے رہنے والے تھے۔ ۱۹۴ھ میں پیدا ہوئے۔ امام بخاری کے والد ماجد اسماعیل بن ابراہیم بھی محدث تھے۔ امام ابی کسن ہی تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ آپ نے ماں کی آغوشِ کرم میں پرورش پائی۔

حفظ حدیث | دس برس کی عمر ہوئی تو امام بخاری نے حدیث یاد کرنی شروع کی۔ آپ سے پہلے جو محدث تھے وہ اپنے اپنے شہروں کی احادیث جمع کرنے پر ہی اکتفا کرتے تھے۔ امام مالک بن انس نے حجاز اور خصوصاً اہل مدینہ کی احادیث جمع کیں۔ ابن جریر نے بھی اہل حجاز اور خصوصاً اہل مکہ کی ہی حدیثیں جمع کیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ امام بخاری سے پہلے بھی ایسے محدثین تھے جو دور دراز کی مسافتیں طے کر کے گوشہ گوشہ سے حدیث جمع کرتے تھے لیکن امام بخاری نے اس دائرہ کو اور زیادہ وسیع کر دیا تھا۔

طلب حدیث میں سفر | چنانچہ امام نے اپنے شہر کی احادیث سننے کے بعد بلخ کا سفر کیا اور وہاں کے محدثین سے حدیثوں کی سماعت کی۔ پھر مرو، تیشاپور، ری، بغداد، بصرہ، کوفہ، مکہ

مدینہ، مصر، دمشق، قیساریہ، عسقلان، حمص تشریف لے گئے اور ان جگہوں سے احادیث حاصل کیں۔

اس طویل سفر میں آپ نے سولہ برس صرف کئے اس مدت میں آپ نے جو کچھ محنت و مشقت برداشت کی ہوگی اس کا اندازہ کون لگا سکتا ہے؟

تتقیدِ حدیث | امام بخاری صرف حدیث سننے پر ہی اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ روایت اور الفاظ و معانی کے اعتبار سے اس کی تنقید کرتے تھے۔ اور ایک ایک راوی کے حالات کی تحقیق کے لئے دور دراز ممالک کے کٹھن سفر اختیار کرتے تھے۔ یہ خدا کا بہت بڑا احسان ہے کہ امام بخاریؒ کی کوششیں بار آور ہوئیں۔ اور وہ احادیث صحیحہ کو احادیث غیر صحیحہ سے متمیز کرنے میں بخوبی کامیاب ہو گئے۔ امام ہمام کی یہ کامیابی دو وصفوں کی رہین منت ہے۔

آپ کا پہلا وصف غیر معمولی قوتِ حافظہ ہے وہ خود فرماتے ہیں۔

”مجھ کو ستر ہزار سے زیادہ حدیثیں یاد ہیں اور صحابہ و تابعین جن کی میں نے حدیث لی ہے ان میں کوئی ایسا نہیں ہے کہ مجھ کو ان کی تاریخ اور جائے پیدائش و وفات اور وطن معلوم نہ ہو اور میں جس کسی صحابی یا تابعی کی کوئی حدیث روایت کرتا ہوں میرے پاس اس کی اصل موجود ہوتی ہے“ ۱۷

پھر اس غیر معمولی قوتِ حافظہ کے ساتھ امام بخاری احادیث لکھ کر انھیں اور زیادہ محفوظ کر دیتے تھے اور صرف لکھنے پر ہی کفایت نہیں کرتے تھے بلکہ رات کے وسط میں بیدار ہو کر ان کا مطالعہ کرتے اور ان میں غور و خوض کرتے تھے۔

دوسری چیز جو امام بخاری کی ماہہ الاتیاز ہے وہ ان کی غیر معمولی مہارتِ تنقیدِ رجال ہے وہ خود فرماتے ہیں۔

”تاریخ میں کوئی ایسا نام نہیں ہے جس کے متعلق مجھ کو کوئی قصہ معلوم نہ ہو“

ایک مرتبہ ان کے سامنے ایک حدیث بیان کی گئی جس کے ایک راوی کا نام عطار
 لیکھارانی تھا۔ کسی نے پوچھا کینخاران کس جگہ کا نام ہے؟ فرمایا یہ یمن کے ایک گاؤں کا نام ہے
 حضرت معاویہ نے ان کو صحابہ کرام کی ایک جماعت کے ساتھ یمن بھیجا تھا۔ وہاں عطار نے
 ان سے یہ دو حدیثیں سنی تھیں۔

امام بخاریؒ ان دو صفوں میں سب سے ممتاز ہونے کے باعث اپنے عہد کے تمام
 بڑے محدثین سے اعلیٰ و افضل سمجھے جاتے تھے اور یہ حضرات بھی حدیث کے معاملہ میں امام کے
 فیصلہ کو ناطق قرار دیتے تھے۔ اسماعیل بن ابی اوس ایک محدث تھے۔ امام بخاریؒ نے ان کے
 مجموعہ احادیث سے چند حدیثیں منتخب کر کے الگ کر لیں تو انھوں نے ان کو اپنے لئے الگ
 لکھ لیا۔ اور پھر ازراہ فخر کہا کرتے تھے یہ وہ حدیثیں ہیں جو محمد بن اسماعیل نے میرے مجموعہ احادیث
 سے منتخب کر لی ہیں۔

حجاز، کوفہ، بصرہ، بغداد، شام اور مصر و خراسان ان میں کوئی مقام ایسا نہیں تھا۔
 جہاں کے علماء و فضلاء امام عالی مقام کی فضیلت و برتری کے سامنے سر تسلیم خم اور ان کی بارگاہ
 علم و کمال میں عقیدت و ارادت کا خراج پیش نہ کرتے ہوں۔ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء
 تاریخ میں آپ نے التاریخ الکبیر، التاریخ الاوسط، اور التاریخ الصغیر کے نام
 سے جو کتابیں تصنیف کی ہیں۔ آپ کی مہارت و امامت فن کی شاہد عدل ہیں، ان کے علاوہ
 ضعیف راویوں کے حالات میں اور علل پرستقل کتابیں کتاب الضعفاء اور کتاب العلل کے
 نام سے تصنیف کیں۔ کئیوں پر آپ کی ایک مستقل کتاب کتاب الکئی کے نام سے ہے ان کے
 اسوا الادب المفرد، الجامع، الکبیر اور المسند الکبیر بھی آپ کی مشہور تصنیفات ہیں۔ ان میں
 سے کتاب الضعفاء الصغیر اور التاریخ الصغیر، انوار احمدی پریس الہ آباد میں چھپ گئی ہیں۔ اور
 التاریخ الکبیر کا ایک حصہ حیدرآباد دکن سے شائع ہوا ہے۔

الجامع الصحیح | آپ کا سب سے بڑا کارنامہ جس کے احسان سے دنیائے اسلام کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی، آپ کی کتاب الجامع الصحیح ہے۔ امام بخاریؒ نے سولہ برس کی محنت شاقہ میں ملک ملک کی خاک چھان کر گوشہ گوشہ سے احادیث صحیحہ کے جو انمول جواہر زیرے فراہم کئے تھے۔ ان میں سے بھی بکمال تحقیق و تدقیق بالکل صحیح احادیث کا انتخاب اپنی صحیح میں جمع کر دیا جس کو بجا طور پر اصح کتاب بعد کتاب اللہ کہا جاتا ہے۔

بعض محدثین نے بخاری کی کسی کسی حدیث پر کلام کیا ہے لیکن مجموعی طور پر اس کو تمام کتب حدیث سے زیادہ صحیح اور مستند مانا گیا ہے۔ ابو جعفر کہتے ہیں امام بخاریؒ نے اپنی کتاب ابن مدینی، امام احمد بن حنبل۔ اور یحییٰ بن معین (جن کی جلالت شان اور ثقاہت و عدالت میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا) کے سامنے پیش کی تو سب نے متفق ہو کر اس کی صحت کی شہادت دی البتہ صرف چار حدیثیں ایسی تھیں جن کو محل نظر و تامل قرار دیا گیا۔ عقیلی کہتے ہیں ان چار حدیثوں میں بھی قول امام بخاری کا ہی صحیح ہے۔ حاکم ابو احمد کہتے ہیں۔

محمد بن اسماعیل الامام فائدہ محمد بن اسماعیل الامام سب سے پہلے بزرگ ہیں
الذی الف الاصول و بین جنہوں نے اصول مرتب کئے اور ان کو لوگوں کے سامنے
للناس وکل من عمل بعدہ بوضاحت بیان کیا۔ جس کسی شخص نے ان کے بعد
فانما اخذنا من کتابہ سے کوئی کام کیا ہے اس نے ان کی ہی کتاب سے لیا ہے۔

امام بخاریؒ کی طرح امام مسلمؒ کا مرتبہ بھی احادیث صحیحہ کے التزام و تنقید میں بہت بلند ہے لیکن مشہور محدث ابوالحسن الدارقطنی فرماتے ہیں اگر بخاریؒ نہ ہوتے تو مسلمؒ کے لئے ترتیب کتاب کی راہ ہموار نہ ہوتی پھر فرماتے ہیں امام مسلمؒ نے بخاریؒ کی کتاب کو ہی اپنے لئے اسوہ بنایا ہے اور اس میں اور احادیث کا اضافہ کر دیا ہے تاہم حسن ترتیب اور طرق اسناد کی جامعیت کے لحاظ سے مسلمؒ کا جو مقام ہے اس کی تفصیل امام مسلمؒ کے حالات میں آگے آئیگی۔

سے مقدمہ فتح الباری ج ۲ ص ۲۰۳۔ ۲۰۴ ایضاً ۲۰۵ ایضاً

تعداد احادیث | حافظ ابن حجر کے قول کے مطابق صحیح بخاری کی کل احادیث ۹۷۰۰۰ سات ہزار
تین سو ستانوے ہیں۔ لیکن ان میں کمر احادیث بھی شامل ہیں۔ البتہ معلقات، متابعات
موقوفات اور مقطوعات داخل نہیں ہیں۔ اگر تعلیقات اور متابعات کو بھی شامل کر لیا جائے تو
پھر یہ تعداد ۹۰۸۲ تک پہنچ جاتی ہے۔ مکررات کو الگ کرنے کے بعد اگر صرف احادیث متصلہ
السنہ کا شمار کیا جائے تو یہ تعداد گھٹ کر ۲۷۶۲ رہ جاتی ہے۔ خود امام بخاری کا ایک بیان ہے
کہ مجھ کو ایک لاکھ صحیح اور دو لاکھ غیر صحیح احادیث یاد ہیں۔ اس کے باوجود ان کا اپنی صحیح میں
صرف دو ہزار سات سو باسٹھ احادیث کا جمع کرنا جس طرح ان کی غایت تحقیق و تنقید کی
دلیل ہے اس بات کا بھی تین ثبوت ہے کہ یہ سب حدیثیں زرخالص ہیں اور ہم ان کو بے چون و چرا
تسلیم کر سکتے ہیں۔

شروط بخاری | اور حقیقت بھی یہی ہے۔ امام بخاری نے حدیث لانے کی جو مخصوص شرطیں
متعین کی ہیں ان کے پورا ہو جانے کے بعد کبھی شک و شبہ کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔
امام خلد مقام کی پہلی شرط جس میں ان کے ساتھ امام مسلم بھی شریک ہیں یہ ہے کہ حدیث کی
اسناد متصل ہونی چاہئے یعنی امام بخاری نے اس کو جس راوی سے سنا ہے اس سے لیکر
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک اس کا سلسلہ برابر بوط ہونا چاہئے۔ یہ نہ ہو کہ درمیان میں
کہیں انقطاع پیدا ہو جائے۔ پھر اس روایت کے جتنے راوی ہیں ان سب کے لئے مسلمان
صادق، غیر مدلس و غیر مختلط عدالت و ثقاہت کی تمام صفات کے ساتھ متصف، ضابط اور
متحفظ، سلیم الذہن، قلیل الوہم اور صحیح الاعتقاد ہونا ضروری ہے۔ پھر جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے،
امام بخاری حدیث کے ہر ٹبرے امام مثلاً امام زہری و نافع کے تلامذہ کو صحبت شیخ کی مدت و
ملازمت اور حفظ و اتقان کے اعتبار سے چند طبقات پر تقسیم کرتے ہیں، یعنی ایک وہ جنہوں نے
سفر و حضر میں شیخ کے ساتھ معیت و مصاحبت رکھی ہے اور پھر وہ حفظ و اتقان میں بھی سب سے

لے تذکرۃ الحفاظ للذہبی تذکرۃ امام بخاری

نمایاں ہیں۔ دوسرے وہ جو حفظ و اتقان میں تو ایسے ہی مشہور ہیں لیکن ان کو شیخ کی صحبت زیادہ
میسر نہ ہو سکی و قس علی ہذا۔ ان مختلف درجات کے محدثین میں سے امام بخاریؒ کی شرط یہ ہے
کہ راوی درجہ اول میں سے ہونا چاہئے۔ درجہ دوم کے راوی کی روایت بھی وہ لے لیتے ہیں
لیکن اصل کے لحاظ سے نہیں بلکہ محض تعلیقاً۔

امام بخاریؒ کی دوسری شرط یہ ہے کہ وہ روایت معنعن کو قبول نہیں کرتے یعنی اگر
کوئی راوی اپنے کسی ہم عصر سے روایت کرتا ہے تو امام بخاریؒ کے نزدیک محض ہم عصر ہونا کافی
نہیں ہے بلکہ جب تک دونوں کی ملاقات ثابت نہیں ہوگی وہ حدیث قبول نہیں کی جائے
گی۔ امام مسلمؒ اس شرط کے خلاف ہیں۔ ان کے نزدیک معاشرت بھی قبول حدیث کے لئے
کافی ہے۔ امام مسلمؒ نے اپنی صحیح کے مقدمہ میں اس پر تفصیل سے بحث کی ہے اور یہ ثابت کیا
ہے کہ روایت معنعنہ کے قبول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اور اکثر محدثین کا میلان خاطر
بھی اسی طرف ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ محدثین کے نزدیک لفظ عن کا استعمال "قال" کی
طرح مطلق اجازت اور اتصال کے لئے ہوتا رہا ہے اس لئے جب تک ارسال کا کوئی قوی
قرینہ نہ ہو محض عن کی وجہ سے ارسال خفی کے شبہ پر روایت کو ترک کر دینا صحیح نہ ہوگا۔ تاہم یہ
ماننا پڑے گا کہ حقیقت خواہ کچھ بھی ہو۔ امام بخاریؒ کا روایت معنعنہ کو قبول نہ کرنا ان کے کمال
احتیاط و اتقان کی دلیل ہے چنانچہ ایک مرتبہ کسی شخص نے امام بخاریؒ سے ایک حدیث کے
متعلق سوال کیا جس میں تدلیس کا گمان ہوتا تھا۔ آپ نے فرمایا "تم کو خیال ہوتا ہے کہ میں
تدلیس کرتا ہوں حالانکہ میں نے اسی تدلیس کے شبہ پر ایک شخص کی دس ہزار بلکہ اس سے
زائد حدیثیں ترک کر دی ہیں۔"

امام مسلمؒ | امام بخاریؒ کے بعد دوسرا مرتبہ امام مسلمؒ کا ہے۔ آپ عربی الاصل تھے۔ قبیلہ
قشیر سے تعلق رکھتے تھے، نام مسلم تھا، کنیت ابو الحسین، نیشاپور آبائی وطن تھا۔ ۲۰۳ھ یا
۲۰۶ھ میں پیدا ہوئے۔ طلب حدیث میں عراق، حجاز، شام اور مصر کا سفر کیا۔ بغداد بھی

کئی مرتبہ تشریف لے گئے اور وہاں حدیث کا درس دیا۔ جس زمانہ میں امام بخاری رحمہ اللہ
نیشاپور میں مقیم تھے امام مسلم نے ان سے بھی استفادہ کیا۔ ۲۶۱ھ میں بمقام نیشاپور
وفات پائی۔

امام مسلم کی ہمہ گیر مہارت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انھوں نے حدیث
اور متعلقات حدیث پر کثرت سے کتابیں تصنیف کیں جن کے نام یہ ہیں

المسند الکبیر علی الرجال۔ کتاب الجامع علی الابواب۔ کتاب

الاسماء والکنی۔ کتاب التمییز۔ کتاب العلل۔ کتاب الوجدان۔ کتاب الافراد

کتاب الاقران۔ کتاب سوا لاتبہ احمد بن حنبل۔ کتاب حدیث عمر بن شعیب

کتاب مشائخ مالک۔ کتاب مشائخ الثوری۔ کتاب مشائخ شعبہ۔

کتاب من لیس له الاراؤ واحد۔ کتاب المخضرمین۔ کتاب

اولاد الصحابة۔ کتاب اوہام المحدثین، کتاب الطبقات۔ کتاب

افراد الشامیین۔ اور کتاب رواة الاعتبار۔

لیکن ان کا سب سے بڑا علمی و دینی کارنامہ صحیح مسلم ہے جس میں انھوں نے

غایت تحقیق و تدقیق کے ساتھ اپنی شروط کے مطابق منتخب احادیث صحیحہ جمع کر دی ہیں

بیان کیا جاتا ہے کہ مکرر احادیث سمیت کل احادیث کی تعداد ۵۲۷ اور مکررات کے علاوہ

تقریباً چار ہزار حدیثیں ہیں۔

صحیح بخاری و صحیح مسلم | امام مسلم کی جلالت شان اور بزرگی و برتری میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا

کاموازنہ | لیکن بخاری اور صحیح مسلم میں موازنہ و مفاضلہ کے وقت جمہور کا فیصلہ

یہ ہے کہ صحیح بخاری کو صحیح مسلم پر افضلیت ہے اور اس کے وجوہ یہ ہیں۔

(۱) رجالِ مسلم میں سے جن لوگوں کو ضعیف کہا گیا ہے ان کی تعداد بہ نسبت ان رجالِ بخاری کے جن کی تضعیف کی گئی ہے زیادہ ہے۔ بخاری کے کل ایسے راوی ۸۰ ہیں اور مسلم کے ۱۶۰ جن سے صرف امام مسلم نے روایت کی ہے۔

(۲) امام بخاری ایسے ضعیف لوگوں کی روایتیں زیادہ نہیں لیتے صرف ایک دو حدیثیں لے لیتے ہیں۔ امام مسلم نے ایسے لوگوں کی حدیثیں زیادہ تعداد میں لی ہیں۔

(۳) امام بخاری صرف درجہ اول (جن کا ذکر اوپر آچکا ہے) کے رُواۃ کی حدیثیں لیتے ہیں شاذ و نادر کہیں تعلیقاً درجہ دوم کے رُواۃ کی حدیثیں بھی نقل کر دیتے ہیں۔

(۴) امام بخاری روایت معنعن پر اس وقت تک متصل السند روایت کا حکم نہیں لگاتے جب تک کہ معنعن اور معنعن عنہ کی ملاقات تاریخی اعتبار سے ثابت نہ ہو۔ اس کے برخلاف امام مسلم روایت معنعن پر بھی اتصال کا حکم لگا دیتے ہیں۔ اگر راوی مدلس نہ ہو۔

یہ وجود ہیں جن کے باعث صحیح بخاری کو صحیح مسلم پر ترجیح دی گئی ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ بعض وجوہ سے صحیح مسلم کو صحیح بخاری پر فوقیت حاصل ہے ان میں ایک بڑی وجہ جیسا کہ حافظ ابن حجر اور بعض دوسرے علماء نے لکھی ہے یہ ہے کہ امام مسلم نے ایک حدیث کے جتنے طرق و اسانید انھیں معلوم تھے سب ایک جگہ جمع کر دیئے ہیں جس سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ طالب حدیث کو بیک وقت ایک حدیث کے تمام طرق معلوم ہو جاتے ہیں اور پھر اس کے لئے حدیث پر حکم لگانا سہل ہو جاتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگرچہ امام مسلم نے بھی امام بخاری کی طرح اپنی کتاب کو ابواب فقہیہ پر مرتب کیا ہے لیکن انھوں نے خود کسی مسئلہ پر حکم لگانے سے اجتناب کیا اور اس باب کے ماتحت صرف احادیث کے جمع کر دینے پر کفایت کی ہے۔

انتقاد بخاری و مسلم | یہاں یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ بعض محدثین نے صحیح بخاری، اور

صحیح مسلم کی بعض حدیثوں پر جو کلام کیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ حدیثیں بالکل ساقط ہیں بلکہ وہ صرف ایک فنی کلام ہے۔ امام بخاریؒ و مسلمؒ نے اپنی تحقیق میں بعض راویوں کو عدول اور ثقہ سمجھا اور ان کی روایت قبول کر لی۔ اب بعض محدثین مثلاً دارقطنی اور ابن جوزی وغیرہ فرماتے ہیں کہ وہ لوگ مشکم فیہ ہیں تو ہم کو ان دونوں میں محاکمہ کرنا ہوگا اور چونکہ اکثریت امام بخاریؒ کی طرف ہے اور ان کی غایت تحقیق و تدقیق مسلم ہے اس لئے فیصلہ انھیں کے حق میں ہونا چاہئے۔

اور اگر تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیا جائے کہ یہ چند حدیثیں ضعیف ہیں تو ان کے علاوہ وہ تمام احادیث جن کی صحت پر امت کا اتفاق ہے انھیں تو تسلیم کرنا ضروری ہے تصنیف حدیث میں اگر ناقدین کا قول صحیح ہو سکتا ہے تو تصحیح کے باب میں بھی ان کا قول معتبر ہوگا۔ آخر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ آپ ان کے ایک قول کو تسلیم کریں اور دوسرے کو رد کر دیں افتوا منونہ ببعض الكتاب وتکفرون ببعض۔

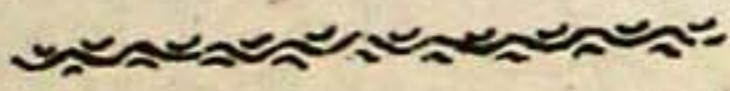
حافظ ابن حجرؒ بخاری و مسلم کے ناقدوں کی تنقید پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ہر مصنف کو یہ معلوم کرنا چاہئے کہ اگرچہ ان میں سے اکثر احادیث اصل موضوع کتاب میں کوئی قدر پیدا نہیں کرتیں کیونکہ جیسا کہ امام ابو عمرو بن الصلاح وغیرہ نے دعویٰ کیا ہے کہ اس کتاب کی تمام احادیث باجماع صحیح ہیں۔ تاہم زیادہ سے زیادہ ہی کہا جائے گا کہ یہ چند مواضع وہ ہیں جن کی صحت میں نزاع ہے اور ان کو وہ تلقی بالقبول حاصل نہیں ہوئی جو کتاب کے بڑے حصہ کو حاصل ہے۔

حافظ ابن تیمیہؒ منہاج السنہ میں فرماتے ہیں:-

تصحیح کے باب میں ائمہ حدیث نے بخاری و مسلم کی تقلید نہیں کی ہے

بلکہ جن حدیثوں کی تصحیح ان دونوں اماموں نے کی ہے وہ سب کی سب تقریباً
 بیس حدیثوں کو مستثنیٰ کر کے امام بخاری و مسلم سے پہلے بھی صحیح تھیں ان کے
 عہد میں بھی صحیح تھیں اور ان کے بعد بھی صحیح رہیں۔ ائمہ فن نے ان دونوں
 کتابوں میں بہت غور و خوض کیا اور پھر تصحیح احادیث میں امام بخاری و مسلم
 سے موافقت کی ۱۷



۱۷ امام بخاری و امام مسلم کے علاوہ چار ائمہ حدیث اور ہیں جن کے مجموعہ ہائے احادیث کو صحیح و ستار
 دیا گیا ہے۔ امام ابو داؤد، ترمذی، نسائی اور امام ابن ماجہ رحمہم اللہ۔ ان سب بزرگوں کے تراجم
 باعث طوالت ہوتے اور پھر ان چار کتابوں کا مرتبہ صحیح بخاری و صحیح مسلم کے بعد ہے منکرین حدیث
 بخاری و مسلم کو ہی مان لیں تو بے غنیمت ہے۔ اس سبب سے ان بزرگوں کے تراجم ترک کرتا ہوں۔

اصولِ درایت

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا اصولِ روایت کی نسبت تھا۔ اب ہم تحقیق روایات و واقعات کے دوسرے اصولِ درایت پر کلام کرتے ہیں جو پہلے اصولِ روایت کی طرح بڑا اہم اصول ہے۔ جس طرح روایت کا اصول قرآن مجید سے ماخوذ ہے۔ اصولِ درایت بھی قرآن مجید نے ہی متعین کر دیا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بعض منافقوں نے ہمت لگائی اور اس کا چرچا اس زور و شور سے کیا کہ بعض مسلمان بھی مذذب ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:-

وَلَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ قُلْتُمْ
مَا يَكُونُ لَنَا أَنْ نَتَكَلَّمَ بِهَذَا
سُبْحَانَكَ هَذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ
اور جب تم نے اس خبر کو سنا تو یہ کیوں نہیں
کہہ دیا کہ ہمیں ایسی بات کبھی مناسب نہیں ہے
سبحان اللہ یہ بڑا بہتان ہے۔

اس آیت میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اس خبر بے بنیاد کو سننے کے بعد تمہیں اس کا ذکر بھی نہیں کرنا چاہئے تھا کیونکہ یہ انتہائی نامعقول بات ہونے کے باعث درایتہ بالکل ساقط الاعتبار تھی۔

درایت کی ابتدا | درایت کی ابتدا خود صحابہ کرام کے عہد میں ہو چکی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت
عہد صحابہ میں | ابو ہریرہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے ایک
حدیث بیان کی جس کا حاصل یہ تھا کہ آگ سے پکی ہوئی چیز کے کھانے پر وضو کرنا چاہئے
حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے یہ سنا تو کہا "اگر یہ صحیح ہے تو اس پانی کے پینے سے بھی
وضو ٹوٹ جانا چاہئے" لہ

حضرت ابن عباسؓ حضرت ابوہریرہؓ کو ضعیف الروایہ نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن چونکہ ان کی یہ روایت درایت کے خلاف تھی اس لئے انہوں نے اس کو قبول نہیں کیا اور یہ سمجھے کہ حضرت ابوہریرہؓ کو سمجھنے میں غلطی ہو گئی ہے۔ درایت کے اصول میں ایک یہ بھی ہے کہ جو روایت کتاب اللہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی مشہور سنت کے خلاف ہو اسے قبول نہ کرنا چاہئے۔ صحابہ کرام کا اس پر بھی تعامل تھا اور وہ ایسی روایت کو صحیح تسلیم نہیں کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے سامنے ایک عورت نے کوئی حدیث بیان کی۔ آپ نے اس کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ ہم ایک عورت کے کہنے پر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو نہیں چھوڑ سکتے۔ ایک حدیث ہے کہ میت کو اس کے پھاندگان کے نوحہ کی وجہ سے عذاب دیا جائے گا۔ حضرت عائشہؓ نے یہ حدیث سنی تو اس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ یہ قرآن مجید کے حکم لا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى، اور وَأَنْ لَّيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى کے خلاف ہے۔ اسی طرح حدیث معراج میں جو یہ آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رویت باری سے مشرف ہوئے۔ تو حضرت عائشہؓ نے اس کی صحت سے بھی انکار کر دیا اور فرمایا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَا تَدْرِكُهُ الْآبْصَارُ۔

ایک مرتبہ حضرت ابوہریرہؓ نے روایت بیان کی کہ برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اسے دھولیتا چاہئے۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ نے یہ سنا تو فرمایا اچھا پھر برتن کا کیا ہوگا؟ ان دونوں بزرگوں کا مطلب یہ تھا کہ اگر ہاتھ کو دھوئے بغیر پانی میں ڈالنے سے پانی ناپاک ہو جاتا ہے تو اس کی وجہ سے برتن (مھل اس) بھی ناپاک ہو جائے گا اور ظاہر ہے کہ اس میں بڑا حرج ہے۔ پس ایسا حکم ایک اصل رفع الحرج کے خلاف ہے اور اس لئے اس کی صحت پر اعتبار کرنا مشکل ہے۔

اس سے بھی زیادہ حقیقت افزو ایک اور واقعہ ہے، ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ کے سامنے بدقالی کے متعلق حضرت ابن عمرؓ کی حدیث نقل کی گئی تو آپ نے فرمایا کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو کبھی کبھی اقوالِ جاہلیت بیان فرماتے تھے۔ یعنی ان کی حیثیت محض حکایت کی ہوتی تھی۔ چنانچہ بدفالی کے متعلق بھی ایسا ہی ہے آپ خود یہ حکم کس طرح بیان کر سکتے تھے جبکہ قرآن مجید میں صاف طور پر فرمایا گیا ہے۔

إِنَّ الْأَشْرَکَ کَلْبٌ بَدِیْئٌ
تَمَامِ حُکْمِ اللّٰهِ تَعَالٰی کے لئے ہی ہے۔

درایت کے اصول | تدوینِ حدیث کا دور آیا اور اس کی صحت وغیرہ کے اصول و ضوابط متعین

کئے گئے تو محدثین نے درایت کے اصول بھی منضبط کئے۔ علامہ سمحانی فرماتے ہیں۔

”صحیح کی پہچان صرف یہی نہیں ہے کہ اس کو ثقہ راویوں نے بیان کیا ہو بلکہ، فہم

معرفت اور کثرتِ سماع اور مذاکرہ سے بھی اس کو پہچانا جاتا ہے۔“

شیخ ابواسحاق الشیرازی لمعہ میں لکھتے ہیں۔

”وہ امور جن کی وجہ سے اگر کسی خبر کو ثقہ نے بھی بیان کیا ہو تب بھی اسے رد

کر دیا جاتا ہے۔ یہ ہیں۔

۱۔ جو روایت مقتضیاتِ عقل کے خلاف ہو اس کا باطل ہونا معلوم ہے کیونکہ شرع

تو مجوزاتِ عقل کے مطابق ہے نہ کہ اس کے خلاف۔

۲۔ کتاب اللہ کی کسی نص، یا سنت متواترہ کے خلاف ہو تو سمجھا جائے گا کہ

اس کی کوئی اصل نہیں ہے یا وہ منسوخ ہے۔

۳۔ اجماع کے خلاف ہو۔

۴۔ ایک ہی شخص تنہا کوئی ایسی روایت بیان کرے جس کا علم تمام لوگوں کو ہونا

ضروری ہو۔

۵۔ راوی تنہا ایسی روایت بیان کرے جس کو عادیۃ اہل تو اتر کے ذریعہ مروی

ہونا چاہئے۔“

فتح المغیث میں ہے کہ حدیث کا موضوع ہونا کبھی الفاظ کی عدم فصاحت سے بھی معلوم ہو جاتا ہے کیونکہ ظاہر ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم افسح العرب والعجم تھے۔

علامہ ابن جوزی نے انھیں اصولِ درایت کو ذرا تفصیل سے بیان کیا ہے۔

قال ابن جوزی وکل حدیث ابن جوزی نے کہا ہے کہ جس حدیث کو دیکھو

رأیتہ فی الف العقول او کہ عقل یا اصول کے خلاف ہے تو جان لو کہ

نیاقض الاصول فاعلم انہ وہ من گھڑت ہے اس کی نسبت اس بحث

موضوع فلا یتكلف اعتبارہ کی ضرورت نہیں کہ اس کے راوی معتبر ہیں یا

ای لا تعتبر رواۃ ولا تنظر فی غیر معتبر۔ اسی طرح وہ حدیث قابل اعتبار نہیں

جرھم او یكون مما یدفعہ الحس ہے جو حسن اور مشاہدہ کے خلاف ہو اور وہ

والمشاهدة او مبانی النص لکتاب حدیث بھی غیر معتبر ہے جو نص کتاب، سنت

والسنة المتواترة او الاجماع متواترہ یا اجماع قطعی کے خلاف ہو اور پھر کسی

القطعی حیث لا یقبل شیء من قسم کی تاویل کی اس میں گنجائش بھی نہ ہو، یا وہ

ذک التاویل او یتضمن الافراط حدیث جس میں ایک ذرا سی بات پر سخت وعید

بالوعید الشدید علی الامر دی گئی ہو، یا اس کے برعکس معمولی سے فعل پر

الیسیر او بالوعد العظیم علی بہت بڑے ثواب کا وعدہ کیا گیا ہو، اس قسم کی

الفعل الیسیر وھذا الاخیر کثیر حدیثیں قصہ گو اور بازاری لوگوں کے کلام میں

موجود فی حدیث القصاص کثرت سے موجود ہوتی ہیں۔ اس طرح وہ حدیث

والطریقیتہ ومن رکتہ المعنی لا تاکلوا بھی ناقابل اعتبار ہے جس میں لغویت پائی جائے

القرعۃ حتی تذبحوها ولذا جعل مثلاً یہ کہ کدو بغیر ذبح نہ کھاؤ۔ اسی کو دیکھ کر

بعضہم ذالک لیل علی کذب بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس کا راوی کا زبانی

راویہ وکل هذا من القرائن
 فی المرئی وقد تكون فی
 الراوی کقصۃ غیاث مع
 المہدی او انفرادہ عن لم
 یدرکہ بما لم یوجد عند
 غیرہما او انفرادہ بشئ مع
 کونہ مما یلزم المکلفین علمہ
 وقطع العذر فیہ کما قررہ
 الخطیب فی اول الکفایۃ او
 بامرہ جسیم یتوفر الدواعی
 علی نقلہ کحصر عدو الحاج
 عن البیت^{۱۵}۔

یہ تمام قرینے تو وہ ہیں جو روایت میں پائے
 جاتے ہیں، کبھی یہ قرائن راوی میں پائے جاتے
 ہیں۔ مثلاً غیاث کا واقعہ خلیفہ مہدی کے ساتھ
 پیش آیا۔ جبکہ کوئی راوی تنہا ایسے شخص سے
 روایت کرے جس سے ملا بھی نہ ہو، یا تنہا کوئی
 ایسی بات بیان کرے جس کا علم اور لوگوں کو
 بھی ہونا ضرور تھا جیسا کہ خطیب نے کفایہ کے
 شروع میں اس کی تصریح کی ہے یا وہ واقعہ
 اتنا اہم ہو کہ اس کے نقل کے اسباب و افر
 ہوں۔ مثلاً یہ واقعہ کہ کسی دشمن نے لوگوں کو
 حج کرنے سے روک دیا۔

بقول علامہ شبلی نعمانی اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ حسب ذیل صورتوں میں
 روایت اعتبار کے قابل نہ ہوگی اور اس کے متعلق اس تحقیق کی ضرورت نہیں کہ اس کے
 راوی معتبر ہیں یا نہیں؟۔

- (۱) جو روایت عقل کے مخالف ہو۔
- (۲) جو روایت اصول مسلمہ کے خلاف ہو۔
- (۳) محسوسات اور مشاہدہ کے خلاف ہو۔
- (۴) قرآن مجید یا حدیث متواتر یا اجماع قطعی کے خلاف ہو اور اس میں تاویل کی

۱۵ فتح المغیث مطبوعہ لکھنؤ ص ۱۱۴۔ اصل کتاب میرے سامنے نہیں ہے۔ میں نے یہ عبارت
 مقدمہ سیرت النبی ص ۱۳۹، ۴۰ سے لی ہے۔

کچھ گنجائش نہ ہو۔

- (۵) جس حدیث میں معمولی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو۔
- (۶) معمولی کام پر بہت بڑے انعام کا وعدہ ہو۔
- (۷) وہ روایت رکیک المعنی ہو۔ مثلاً گدو کو بغیر ذبح نہ کھاؤ۔
- (۸) جو راوی کسی شخص سے ایسی روایت کرتا ہے کہ کسی اور نے نہیں کی اور یہ راوی اس شخص سے نہ ملا ہو۔
- (۹) جو روایت ایسی ہو کہ تمام لوگوں کو اس سے واقف ہونے کی ضرورت ہو یا نہیہمہ ایک راوی کے سوا کسی اور نے اس کی روایت نہ کی ہو۔
- (۱۰) جس روایت میں ایسا قابل اعتنا واقعہ بیان کیا گیا ہو کہ اگر وقوع میں آتا تو سینکڑوں راوی اس کو بیان کرتے۔ اس کے باوجود صرف ایک ہی راوی نے اس کو بیان کیا ہے۔

ملا علی قاری نے موضوعات کے خاتمہ پر حدیثوں کے نامعتبر ہونے کے چند اصول تفصیل سے لکھے ہیں اور ان کی مثالیں نقل کی ہیں ہم اس کا خلاصہ اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔

- (۱) جس حدیث میں ایسی فضول باتیں ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نہیں نکل سکتیں مثلاً یہ کہ جو شخص لا الہ الا اللہ کہتا ہے خدا اس کلمہ سے ایک پرند پیدا کرتا ہے جس کی ستر زبانیں ہوتی ہیں اور ہر زبان میں ستر ہزار لغت ہوتے ہیں۔
- (۲) وہ حدیث جو مشاہدہ کے خلاف ہو مثلاً یہ کہ بینگن کھانا ہر مرض کی دوا ہے۔
- (۳) جو حدیث صریح حدیثوں کے مخالف ہو۔

- (۴) جو حدیث واقع کے خلاف ہو، مثلاً یہ کہ دھوپ میں رکھے ہوئے پانی سے غسل نہیں کرتا چاہے کہ اس سے برص پیدا ہوتا ہے (اگرچہ تجربہ کی رو سے یہ مضمون درست ہے)۔

سنہ یہ پورا خلاصہ مقدمہ سیرت النبی سے ماخوذ ہے۔

(۵) جو حدیث انبیاء کرام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کلام سے مشابہت نہ رکھتی ہو مثلاً یہ حدیث کہ تین چیزیں نظر کو ترقی دیتی ہیں، سبزہ زار، آبِ رواں اور خوبصورت چہرہ کا دیکھنا (۶) وہ حدیثیں جن میں آئندہ واقعات کی پیش گوئی بقید تاریخ مذکور ہو مثلاً یہ کہ فلاں سنہ اور فلاں تاریخ میں یہ واقعہ پیش آئے گا۔

(۷) وہ حدیثیں جو طبیعوں کے کلام سے زیادہ مشابہ ہوں۔ مثلاً یہ کہ ہر ایسے کے کھانے سے قوت آتی ہے یا یہ کہ مسلمان شیریں ہوتا ہے اور شیرینی پسند کرتا ہے۔

(۸) وہ حدیثیں جن کے غلط ہونے کے دلائل موجود ہوں۔ مثلاً عوج بن عنق کا قد تین ہزار گز تھا۔

(۹) وہ حدیث جو صریح قرآن کے خلاف ہو۔ مثلاً یہ کہ دنیا کی عمر سات ہزار برس کی ہوگی اگر یہ روایت صحیح مان لی جائے تو ہر شخص بمبارے گا کہ قیامت کب آئے گی حالانکہ قرآن سے ثابت ہے کہ قیامت کا وقت کسی کو معلوم نہیں ہے۔

(۱۰) بعض وہ حدیثیں جو خضر علیہ السلام کے متعلق ہیں۔

(۱۱) جس حدیث کے الفاظ رکیک ہوں۔

(۱۲) بعض وہ حدیثیں جو قرآن مجید کی الگ الگ سورتوں کے فضائل میں وارد ہیں۔

صاحب کشف الاسرار نے بھی قریب قریب یہی لکھا ہے۔

”خبر واحد اگر مقتضی عقل کے خلاف ہو تو ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ اس میں بغیر

کسی تکلفِ بارود کے تاویل ہو سکتی ہے یا نہیں۔ اگر تاویل صحیح ہو سکے تو اس خبر

کو قبول کر لینا چاہئے ورنہ اسے رد کر دینا چاہئے۔ اسی طرح جو خبر، نص کتاب،

سنت متواترہ یا اجماع کے خلاف ہو تو اسے بھی رد کر دینا ضروری ہے کیونکہ

یہ تمام دلیلیں قطعی ہیں اور خبر واحد ظنی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ قطعی اور ظنی میں کوئی

تعارض نہیں ہوتا بلکہ قطعی کے مقابلہ میں ظنی ساقط ہو جاتا ہے۔“ ملہ

ان اصول کی بنا پر ہر زمانہ میں روایت پر تنقید کی گئی ہے۔ حافظ ابن حجر روایت معراج کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ثابت کی روایت میں جو فَرَّ بَطْنُهُ بِالْحَلْقَةِ میں نے براق کو حلقہ سے باندھ دیا آیا ہے تو حضرت خذیفہ اس کی صحت سے انکار کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے براق کو اس لئے باندھ دیا تھا کہ اس کے بھاگ جانے کا اندیشہ تھا؟ بھلا یہ کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ اللہ نے اس وقت آپ کے لئے عالم غیب و شہادت کو مسخر کر دیا تھا۔

اسماعیلی بخاری کی روایت جس کا مضمون یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اپنے والد آزر سے قیامت کے دن اس حال میں ملیں گے کہ آزر کے چہرہ پر تار کول ملا ہوا ہوگا۔ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اس خبر کی صحت میں نظر ہے اور دلیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔ پس جب اللہ تعالیٰ ان سے وعدہ کر چکا ہے کہ وہ قیامت کے دن ان کے باپ آزر کو رسوا نہیں کرے گا تو پھر اس کے خلاف کس طرح کر سکتا ہے۔

حافظ ابن حجر حدیث ابی ہریرہؓ

خلق الله آدم وطوله

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو پیدا کیا اور

ستون ذرا عا

ان کا طول ساٹھ گز تھا۔

کے متعلق کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اہم گزشتہ کے جو آثار ثمود کے دیار کی طرح مٹے ہوئے پائے جاتے ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قد و قامت ترقیب سابق کے اقتضار کے مطابق بہت زیادہ طویل نہیں تھے۔ حالانکہ ان کا زمانہ بھی بہت قدیم ہے۔ اور جو زمانہ قوم ثمود اور حضرت آدمؑ کے درمیان ہے وہ اس زمانہ سے کم ہے جو قوم ثمود اور امت مسلمہ کے شروع زمانہ کے درمیان ہے۔ اب تک مجھ کو اس اشکال کا حل معلوم نہیں ہوا۔

اس تقریر سے یہ واضح ہوا ہو گا کہ محدثین نے تحقیق کے دونوں اصول روایت اور
 درایت دونوں کی تعیین و تشخیص میں اوزان پر عمل کرنے میں یکساں اہتمام کیا۔ اور تنقید روایت
 میں دونوں سے کام لیا ہے۔ تاہم اس میں شبہ نہیں کہ بعض خاص خاص محدثین وار قطنی وغیرہ
 نے اسناد پر زیادہ زور دیا ہے اور حدیث کے متن کی طرف اتنا اعتنا نہیں کیا لیکن اس کی وجہ صرف
 یہ ہے کہ محدثین یہ سمجھتے تھے کہ اصول درایت ہر شخص کو معلوم ہو سکتے ہیں جو قرآن اور اجماع سے
 واقف ہو اور عقل سلیم رکھتا ہو۔ صرف ایک اسناد کا فن ہی ایسا دقیق اور مشکل ہے کہ محدثین کے
 سوا دوسروں کو اس کا علم نہیں ہوتا۔

اب روایت اور درایت کے ان اصولوں کو اور محدثین نے ان کی تحقیق و تاکید میں جو
 کوششیں کی ہیں ان سب پر غور کرو اور بتاؤ کیا کسی روایت کی توثیق و تصدیق کے لئے اس سے
 بلند کوئی اور معیار ہو سکتا ہے؟ کیا دنیا کی تاریخ میں کوئی ایک قوم بھی ایسی ہے جس نے اسناد اور
 متن کے ہر ممکن سے ممکن پہلو کو سامنے رکھ کر اس کی چھان بین میں انسانی کوشش کا کوئی
 دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا ہو؟ اسناد میں عقلی اعتبار سے جتنے احتمالات ہو سکتے ہیں ان سب پر
 ان بزرگوں نے مبصرانہ نگاہ ڈالی اور احتیاط کا یہ عالم کہ جہاں کذب کا ذرا سا شائبہ بھی نظر آیا اسے
 فوراً ترک کر دیا۔ اسی طرح متن حدیث کی صحت معلوم کرنے کی غرض سے محدثین نے درایت
 کے اصول متعین کئے۔ لفظ معنی عبارت اور طرز بیان ہر لحاظ سے اس کو تنقید کی سوٹی پر
 پرکھا۔ صحیح، ضعیف اور موضوع، ان کے الگ الگ خصائص بیان کئے، ان کے اوصاف
 متعین کئے اور تمام ذخیرہ ہائے حدیث کو نگہال کر ہر حدیث پر حکم لگایا اور ایک نوع کو دوسرے
 سے الگ کر دیا۔

امام بخاری، امام مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی، اور ابن ماجہ و غیر جمہم الشراجمین نے جس
 طرح ڈھونڈ ڈھونڈ کر صحیح احادیث جمع کیں اور ان کو مرتب کر کے شائع کیا۔ اسی طرح بعض

۱۷ چنانچہ امام بخاری، امام نسائی، امام صفحانی، امام مسلم، علامہ ابن جوزی نے کتاب الضعفاء (باقی حاشیہ ص ۱۸۰ پر)

محدثین نے موضوع حدیثوں کو جمع کیا اور ان کو کتاب کی شکل میں ترتیب دیا۔ تاکہ بحکم
و بصدقات متبیین الاشیاء مات کو دیکھ کر لوگوں کو دن کی پہچان ہو جائے۔ پھر روایت
پر جو کتابیں لکھی گئیں ان میں ایک ایک راوی حدیث کے حالات بکمال دقیق النظری
تحقیق و تفتیش کرنے کے بعد لکھے گئے۔ یہاں تک کہ اب ایک راوی بھی ایسا نہیں ہے جس پر
محدثین نے کلام نہ کیا ہو۔ پھر جو ثقہ راوی تھے ان پر الگ اور جو ضعیف تھے ان پر الگ
اور جو بدلس یا وضاعین و کذابین تھے ان پر الگ ضخیم ضخیم کتابیں لکھیں، سب کے
چہروں سے نقاب اٹھا کر اصل حقیقت کو بے حجاب کر کے رکھ دیا۔ انھوں نے دودھ کا
دودھ اور پانی کا پانی ایک دوسرے سے اس طرح متمیز کر دیا کہ آج صاحب چشم بصیرت
بے تکلف دونوں میں خط امتیاز کھینچ سکتا ہے۔

علامہ ابن قتیبہ نے اپنی کتاب تاویل مختلف الحدیث کے شروع میں متکلمین
کے وہ اعتراضات نقل کئے ہیں جو وہ محدثین پر کرتے ہیں۔ محدثین کی طرف سے ان اعتراضات
کا جواب دینے کے بعد لکھتے ہیں۔

”اصحاب حدیث نے حق اس کی اپنی جگہ سے طلب کرنا چاہا ہے اور ان کی
خواہش یہ رہی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سنن کا اتباع کر کے
اللہ کا تقرب حاصل کریں۔ محدثین سنن معلوم کرنے کے بعد برابر ان کی تحقیق و تفتیش
اور چھان بین میں لگے رہے۔ یہاں تک کہ انھوں نے ان کے صحیح اور سقیم میں،
ناسخ اور منسوخ میں پوری بصیرت کے ساتھ امتیاز کر لیا۔ اور فقہاریں سے جو
ارباب رائے سنن کے خلاف تھے ان کو بھی انھوں نے پہچان لیا اور لوگوں کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۹) یا موضوعات کے نام سے کتابیں لکھیں (کشف الظنون ج ۲ ص ۱۸۲) ان کے علاوہ
مذا علی قاری نے موضوعات اور علامہ محمد طاہر بن علی نے تذکرۃ الموضوعات لکھی جس کے ذیل میں قانون الموضوعات
والضعفاء بھی ہے۔

اس پر متنبہ کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حق نظر ہوا گیا جبکہ وہ ٹٹنے کے قریب تھا اور وہ
 ہاہائے لگا۔ جبکہ اس پر شہ مردگی کا غلبہ ہو چلا تھا اور سنن کے وہ لوگ بھی مطیع
 ہو گئے جو ان سے انحراف کرتے تھے اور جو پہلے ان سے عقلمت برتتے تھے۔
 ان میں اب بیداری پیدا ہو گئی۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال طیبہ
 کے مطابق احکام صادر ہونے لگے جبکہ فلاں فلاں لوگوں کے انتساب سے
 حکم دیا جاتا تھا۔

محدثین کرام نے اپنی عمریں صرف کر کے طرح طرح کے مصائب و آلام برداشت
 کر کے صحیح و غیر صحیح دونوں قسم کی احادیث مرتب کر دی ہیں، ان کے مجموعے آج ہمارے
 سامنے موجود ہیں، تنقید کے اصول الگ ہم کو بتا دئے گئے ہیں۔ آج اگر کوئی حدیث آپ کی سمجھ
 میں نہ آئے تو بے شک آپ کو حق ہے کہ اصول کی روشنی میں اس پر کلام کریں جس طرح زمانہ
 سلف کے محدثین و ناقدین نے کیا تھا۔ لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ آپ اپنی آرام کری پر
 بیٹھے ہوئے بیک جنبش قلم محدثین کی ساہا سال کی محنتوں اور جانکاہیوں پر خط نسخ کھینچ دیں
 جن کی کوششیں آج اصل دین کی حفاظت و بقا کی کفیل ہیں اور جن کو ہر زمانہ میں قبول عام
 حاصل رہا ہے۔ بازار میں بے ایمانی اور مکاری و فریب دہی کے عام ہو جانے کی وجہ سے
 اگر خالص گھی اور دودھ کا ملنا کیاب ہو گیا ہے تو یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ آپ سرے
 سے گھی اور دودھ کا استعمال ہی ترک کر دیں۔ حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ بدن میں بطاقت
 پیدا کرنے کے لئے ان دونوں کا استعمال از بس ضروری ہے اور پھر چند مخلص و نیک
 نیت اور ایماندار دکاندار ایسے بھی ہیں جو خالص گھی اور دودھ فراہم کرنے کا اہتمام
 کرتے ہیں۔

صحابہ کرام کی سیرت سے متعلق جو روایات ہیں۔ اگر وہ تاریخی اعتبار سے صحیح ہیں،
 (اور غالباً اس سے انکار منکرین حدیث کو بھی نہیں ہے) تو ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ اس کی

کیا وجہ ہے کہ وضاعین و کذابین کی وجہ سے اگرچہ صحابہ کرام روایات کے قبول کرنے میں بڑی احتیاط کرتے تھے لیکن یہ انھوں نے نہیں کیا کہ وضع حدیث کے خوف سے روایت کا قبول کرنا ہی مطلقاً ترک کر دیا ہو۔

اسی طرح علامہ ابن جوزی وغیرہ نے بخاری تک کی بعض حدیثوں کی تضعیف کی۔ لیکن یہ انھوں نے بھی نہیں فرمایا کہ جب بخاری ایسی صحیح اور مستند کتاب میں بعض ضعیف حدیثیں درج ہو گئی ہیں تو اب اس کا اور کسی اور کتاب حدیث کا اعتبار باقی نہیں رہا۔ اس لئے حدیث کو ہی تسلیم نہ کرنا چاہئے۔

کیا عجب تماشہ ہے کہ آج منکرین حدیث انکار حدیث کے لئے استدلال کرتے ہیں تو اس میں محدثین کے ہی بنائے ہوئے اصولوں سے کام لیتے ہیں۔ انھیں کے بنائے ہوئے ضعیف راوی کو ضعیف اور وضاع کو وضاع کہتے ہیں۔ مثلاً ایک دو حدیثیں پیش کر کے وہ کہتے ہیں کہ دیکھئے یہ قرآن کے خلاف ہیں۔ اس لئے ناقابل اعتبار ہیں۔ ہم کہتے ہیں یہ آپ نے نئی بات کیا کہی؟ یہ تو خود محدثین اصول درایت کے سلسلہ میں بیان کر چکے ہیں کہ جو حدیث نص کتاب اور سنت متواترہ کے خلاف ہو اسے رد کر دینا چاہئے۔ بس ضرورت اس کی ہے کہ آپ ان دو حدیثوں کا نص کتاب کے مخالف ہونا ثابت کر دیں۔ اگر آپ اس میں کامیاب ہو گئے تو ہم بھی آپ کے ہمینوا ہو کر کہیں گے کہ بے شبہ ان حدیثوں کو قبول نہ کرنا چاہئے۔ لیکن اس سے زیادہ سے زیادہ یہی تو لازم آیا کہ یہ دو ایک حدیثیں قرآنی نص کے مخالف ہونے کی وجہ سے مسترد ہو گئیں اس سے یہ نتیجہ کس طرح لازم آ گیا کہ ان دو ایک حدیثوں کی وجہ سے پورا ذخیرہ احادیث ہی ناقابل اعتبار قرار پاجائے۔

منکرین حدیث کو غور کرنا چاہئے کہ اگر وہ کسی ضعیف راوی کو ضعیف۔ کسی وضاع کو وضاع کہتے ہیں محدثین کی رہنمائی کے محتاج ہیں اور انھیں کے قول پر اعتماد کرنے پر مجبور ہیں تو پھر اس چیز میں ان کے اقوال کو معتبر مانتا اور حکم حدیث میں ان کو ناقابل اعتبار قرار دیتا

حد درجہ کی نا انصافی اور مذبح قلب کی دلیل نہیں تو کیا ہے؟ ربنا لا تزخ قلوبنا بعد
اذ ہدیتنا وہب لنا من لدنک رحمتہ انک انت الوہاب۔

سوال یہ ہے کہ آپ کو آج اس کا یقین کیونکر آیا کہ لوگ وضع حدیث کرتے تھے؟ محض
محدثین و ارباب تاریخ کے کہنے سے! پس اگر آپ ان کے اس قول کو صحیح مانتے ہیں تو جب
وہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے اسے درست تسلیم کیوں نہیں کرتے۔

ظنیت حدیث | اس موقع پر یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ منکرین حدیث عموماً یہ کہتے ہیں کہ
محدثین کی تصریح کے مطابق اخبار آحاد مفید ظن ہیں یعنی ان سے یقین حاصل نہیں ہوتا اور
قرآن مجید میں حکم ان الظن لا یغنی عن الحق شیئاً ظن کے قبول کرنے سے منع فرمایا گیا ہے
اس لئے احادیث ناقابل قبول ہیں۔

اس دلیل کے جواب میں حضرت الاستاذ مولانا شبیر احمد عثمانی شارح صحیح مسلم نے مقدمہ
فتح الملہم میں بہت واضح تقریر کی ہے۔ ہم اس کا خلاصہ ذیل میں درج کرتے ہیں۔

مشہور یہ ہے کہ اخبار آحاد قرآن سے مجرد ہوں تو ظن کا فائدہ دیتے ہیں اور

متواتر علم یقین کا۔ اب ہم ظن کے معنی کی تشریح کرتے ہیں۔

امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں۔

ظن اس کیفیت کا نام ہے جو کسی علامت سے حاصل ہو۔ یہی کیفیت قوی

ہو جاتی ہے تو علم بن جاتی ہے اور جب حد سے زیادہ ضعیف ہو جاتی ہے تو توہم

کی حد سے متجاوز نہیں ہوتی۔ پس اللہ تعالیٰ کا ارشاد الذین یظنون انہم فلا قوا

رہیم اور نیز یظنون انہم فلا قوا اللہ ان دونوں میں ظن معنی یقین ہے۔ اس

کے برخلاف ان آیتوں

ان الذین اختلفوا فیہ

وہ لوگ جنہوں نے اس میں اختلاف کیا ہے

لفی شکیۃ منہ ما لہم

وہ بے شبہ اس کے متعلق شک و شبہ میں پڑے

بہرین علمہ الا اتباع الظن
ہیں۔ ان کو اس کا کوئی علم نہیں ہے۔ بجز ظن
کی پیروی کے اور کچھ نہیں۔

اور وتظنون بالله الظنونا
اور وان الظن لا یغیب
ظن حق کا کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔
من الحق شیئاً۔

میں ظن سے مراد وہ اوہام ہیں جو کسی صحیح دلیل کے بغیر پیدا ہوتے ہیں۔ قرآن مجید
سے ظن کے معنی کی اس تعیین و تشخیص کے بعد اب دیکھنا چاہئے کہ محدثین کے
نزدیک ظن سے مراد کیا ہوتی ہے۔

پس ظن جس کا فائدہ خبر واحد دیتی ہے وہ کیفیت قوی راجح ہے جو قریب
بہ یقین ہو، نہ وہ ضعیف مرجوح جو حد توہم سے متجاوز نہیں ہوتی۔ اور ظن
بمعنی اول علم کی ایک نوع ہے جس پر اکثر احکام دینی و معاملات دنیوی کا
دار و مدار ہے۔ لیکن یہ لفظ مختلف معانی میں مشترک ہونے اور وہم کے معنی
میں شائع ہو جانے کی وجہ سے اکثر اشتباہ والتباس کا باعث بن جاتا ہے،
اس لئے بہتر یہ ہے کہ اس سے احتراز کیا جائے اور اس قسم کے مقامات میں اس کو
استعمال نہ کیا جائے۔

امام فخر الاسلام نے اسی وجہ سے خوب کہا ہے کہ متواتر سے علم یقین اور
مشہور سے علم الطمانیت پیدا ہوتا ہے اور خبر واحد سے علم غالب الرائے
کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اس بنا پر جو شخص اخبار آحاد پر عمل پیرا ہوتا ہے
گویا وہ اس چیز کی پیروی کرتا ہے جس کا اسے علم حاصل ہے۔ اس کو ہم اتباع
ظن جو مذموم ہے نہیں کہہ سکتے۔ خبر واحد کا قبول کرنا واضح ضرورتوں میں سے
ہے۔ جس سے انکار بجز ایک منکر منکر کے کوئی اور نہیں کر سکتا۔ ہم شب و روز

اپنے معاملات میں اس پر عمل کرتے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر
 مسئلہ اور ہر واقعہ میں ہر خبر واحد کے قبول کرنے کی حیثیت بالکل یکساں ہوتی ہو
 بلکہ وجدان صحیح اخبار کے باہمی فروق و مراتب کا خود بخود حکم کر دیتا ہے۔ فرض
 کیجئے، ایک شخص کہتا ہے کہ فلاں صاحب آپ کو بلاتے ہیں تو آپ کو یہ سُنکر
 تردد نہیں ہوتا اور اس بات کا یقین آجاتا ہے۔ لیکن اگر یہی شخص آپ سے کہے
 کہ آپ کو بادشاہ نے اپنی محفل میں بلایا ہے تو اس خبر کو سُن کر آپ کے دل میں
 اختلاج و انقباض پیدا ہو جاتا ہے اور انشراح صدر اس وقت تک نہیں ہوتا جب
 تک کہ قرآن و شواہد سے اس کی تائید نہیں ہو جاتی۔ یہی مراد ہے ان لوگوں کی جو
 کہتے ہیں کہ شہادت بہ قدر دعویٰ اور دلیل بمرتبہ مدلول ہونی چاہئے۔ ہمارے علماء محدثین
 کا تعالٰیٰ اسی پر ہے۔ الخ

اس تقریر پر ہم اتنا اضافہ اور کرنا چاہتے ہیں کہ قرآن مجید میں واقعہ افک کے
 بارہ میں ہے۔

وَلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ	تم لوگوں نے جب یہ خبر سنی تھی تو مومن
الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ	مردوں اور عورتوں نے کیوں اچھی بات
بِأَنْفُسِهِمْ خَيْرًا۔	کا ظن نہیں کیا۔

اس آیت سے جہاں یہ معلوم ہوتی ہے کہ ظن احتمالِ مرجوح کے معنی میں نہیں آتا
 بلکہ وثوق کے ساتھ کسی شے کے جاننے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ بات بھی معلوم ہوتی
 ہے کہ اگر کسی شے کے متعلق گمانِ غالب پیدا کرنے کے لئے قرآن و آثار موجود ہوں جیسا کہ
 واقعہ افک میں حضرت عائشہؓ کی عصمتِ مآبی و پاک و امانی کا گمانِ غالب پیدا کرنے کے
 لئے قرآن موجود تھے تو ہمیں اس پر وثوق اور بھروسہ کر لینا چاہئے اور اگر ہم قرآن کی شہادت کے

باوجود ایسا نہیں کریں گے تو اس پر ہم سے ایسا ہی مواخذہ ہوگا جیسا کہ آیت بالا میں منافقین کی
اڑائی ہوئی خبر کو سن کر حضرت عائشہؓ کے معاملہ میں مذہب ہو جانے والے مسلمان مردوں
اور عورتوں سے ہوا۔

ظن کے معنی کی اس تحقیق و تہقیر کے بعد یہ مسئلہ خود بخود واضح ہو جاتا ہے کہ احادیث
سے جو فائدہ ظن حاصل ہوتا ہے اس کی بنا پر حدیثیں کس حد تک قابل عمل ہیں اور ان سے
احکام کے استنباط میں اور قرآن مجید کی مختلف الاحتمالات آیات کے معانی کی تعیین میں
کس حد تک مدد لی جاسکتی ہے۔

فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ

محدثین کی بے لوث خدایات علم و تدبیر

بعض لوگ حدیث کی بے اعتباری ثابت کرنے کے لئے یہ بھی کہتے ہیں کہ حدیث کی تدوین چونکہ خلفائے بنی امیہ اور خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں ہوئی ہے۔ اور بعض ائمہ حدیث مثلاً امام زہریؒ اور خلفائے راہ و رسم رکھتے تھے اس لئے حدیث کا ذخیرہ وقت کے عام سیاسی اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکا۔

اب آئیے تاریخ کی روشنی میں یہ دیکھیں کہ یہ بدگمانی کہاں تک صحیح ہے؟ یہ ہر شخص کو معلوم ہے کہ خلفائے بنی امیہ سیاسی حیثیت سے حضرت علیؑ کرم اللہ وجہہ کے سخت مخالف تھے اور اسی طرح خلفائے بنی عباس حضرت معاویہؓ کو اپنا زبردست سیاسی حریف سمجھتے تھے۔ اس بنا پر اگر محدثین نے ان خلفاء کی جذبہ داری کی ہوتی تو بنو امیہ کے عہد میں حدیثوں کا دفتر حضرت معاویہؓ کے مناقب اور حضرت علیؑ کے مثالب سے مملو نظر آتا اور پھر خلفائے عباسیہ اپنے عہد میں حضرت عباسؓ اور حضرت علیؑ کی منقبت میں اور حضرت معاویہؓ کی مذمت میں کثرت سے حدیثیں روایت کرواتے لیکن ذخیرہ احادیث کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی حدیثوں سے دفتر احادیث خالی ہے۔ اور مناقب صحابہ کے ذیل میں حضرت علیؑ اور حضرت معاویہؓ کے فضائل بیان بھی کئے گئے ہیں تو ان میں کوئی خاص بات نہیں۔ انھیں کی کیا خصوصیت ہے اور صحابہ کے فضائل بھی مذکور ہیں اور کہیں کسی کتاب میں اگر اس قسم کی کوئی حدیث ہے بھی جس سے بیجا حمایت کی بجاتی ہو تو اسے محدثین نے موضوع بنا کر ساقط الاعتبار قرار دیا ہے۔

پھر محدثین کے واقعات زندگی دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ گدایان سکندر دل کس استغنا کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اور بے لوث و بے غرض ہونے کی وجہ سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر

میں بڑے سے بڑے جابر و ظالم بادشاہ کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ علم و بصیرت کی روشنی میں جو بات انہیں حق معلوم ہوتی تھی اسے بر ملا کہتے تھے اور جان و مال، عزت و آبرو کسی چیز کا خیال اعلانِ حق سے انہیں باز نہیں رکھ سکتا تھا۔ خلفار سے راہ و رسم رکھنے میں امام زہریؒ اور امام مالکؒ کا نام زیادہ نمایاں ہے۔ لیکن ان دونوں بزرگوں کا بھی حال یہ تھا کہ حق کے معاملہ میں خلیفہ کی رضا جوئی کی ذرا پرواہ نہیں کرتے تھے۔

ایک مرتبہ ولید بن عبد الملک نے امام زہریؒ سے کہا کیا تم کو یہ روایت پہنچی ہے کہ جن لوگوں نے حضرت عائشہؓ پر تمہمت لگائی ان میں علیؓ بھی داخل تھے؟ امام زہریؒ نے فرمایا "نہیں" البتہ تمہاری قوم کے دو آدمی یعنی ابو سلمہ بن عبد الرحمن اور ابو بکر بن عبد الرحمن بن حارث نے مجھ سے روایت کی کہ حضرت عائشہؓ نے ان سے کہا کہ علیؓ اس الزام سے بری تھے۔

ایک روایت میں ہے کہ ہشام بن عبد الملک کا خیال تھا کہ قرآن مجید میں حضرت عائشہؓ کے واقعہ افک کے سلسلہ میں جو

وَالَّذِي تَوَلَّى كِبْرًا مِنْهُمْ
لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ
جس نے ان میں سے اس الزام میں بڑا حصہ لیا
ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔

فرمایا گیا ہے تو اس سے مراد حضرت علیؓ ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ سلیمان بن یسار ہشام کے پاس آئے تو اس نے پوچھا وَالَّذِي تَوَلَّى كِبْرًا مِنْهُمْ سے کون مراد ہے؟ وہ بولے "عبد اللہ بن ابی ہشام بولا "جھوٹ کہتے ہو وہ علیؓ ہیں" انھوں نے کہا "امیر المؤمنین جو کچھ کہتے ہیں وہی اس کو خوب جانتے ہیں پھر زہریؒ آئے تو ان سے بھی یہی سوال کیا اور انھوں نے وہی جواب دیا جو سلیمان بن یسار نے دیا تھا اس نے کہا تم جھوٹ کہتے ہو وہ علیؓ ہیں۔ انھوں نے کہا "میں جھوٹ کہوں گا؟ تمہارے باپ نہ ہو اگر آسمان سے ایک مناد۔ پکارے کہ خدا نے جھوٹ جائز کر دیا میں تب بھی جھوٹ نہ بولوں گا۔ مجھ سے عروہ، سعید عبد اللہ اور علقمہ نے حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے کہ وہ عبد اللہ بن ابی تھا۔ اس واقعہ کے اخیر میں ہے کہ ہشام نے کہا "ہم نے اس بڑے کو غصہ دلا دیا۔"

اسی قسم کا بلکہ اس سے زیادہ صاف واقعہ حضرت اعمش کا ہے۔ ایک مرتبہ شام بن عبد الملک نے ان کو لکھا کہ آپ حضرت عثمان کے فضائل اور حضرت علی کے معائب قلمبند کر لیجئے انھوں نے خط بکری کے منہ میں ڈال دیا جو اس کو چبا گئی، پھر قاصد سے کہا جا کر کہدینا یہی تمہارا جواب ہے۔ قاصد بولا "خلیفہ نے قسم کھائی ہے اگر میں جواب لیکر نہ پہنچا تو وہ مجھ کو قتل کر دے گا" یہ سن کر حضرت اعمش نے مجبوراً جواب لکھا "اے امیر المؤمنین اگر حضرت عثمان میں تمام دنیا کی خوبیاں ہوں تو وہ تمہارے لئے مفید نہیں اور اگر حضرت علی میں تمام جہان کی برائیاں ہوں تو وہ نقصان رساں نہیں صرف اپنی ہی ذات کا خیال رکھو۔"

حجاج بن محمد بن یوسف ثقفی ظلم و ستم کی دنیا کا نمایاں ہیرو ہے، ایک مرتبہ اس کے سامنے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا ذکر آیا تو اس نے کہا "وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذریعات میں داخل نہ تھے۔ اس مجلس میں یحییٰ بن یحییٰ بن یحییٰ موجود تھے انھوں نے کہا "اے امیر تو جھوٹ بولتا ہے" بولا "اس پر قرآن سے دلیل لاؤ ورنہ میں تم کو قتل کر دوں گا انھوں نے یہ آیت پڑھی۔

وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدُ وَسُلَيْمَانُ	انھیں کی نسل میں سے داؤد، سلیمان
وَاَيُّوبَ وَيُوسُفَ وَمُوسَىٰ وَهَارُونَ	ایوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون ہیں۔
وَالْحُسَيْنِ وَذَكَرْنَا وَيْحِيٰ وَ	اور ہم نیک کام کرنے والوں کو ایسا ہی صلہ دیتے ہیں اور ایسے ہی ہیں زکریا، یحییٰ، عیسیٰ
عِيسَىٰ وَآلِيسَىٰ	اور الیاس علیہم السلام ہیں۔

اور پھر کہا حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہاں کے ذریعہ سے حضرت آدم کی نسل میں داخل ہیں۔ پس اسی طرح حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی ماں کے واسطے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذریت میں داخل ہیں۔ حجاج بولا "تم کہتے تو سچ ہو، لیکن یہ بتاؤ تم نے میری مجلس میں مجھ کو کیوں جھٹلایا" فرمایا اس معاہدہ خداوندی کی وجہ سے۔

وَإِذَا أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ
 أَوْثَرُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَا لِلنَّاسِ
 وَلَا تَكْتُمُونَ فَخَبَّرُوا وَرَأَى
 ظُهُورَهُمْ وَاشْتَرَوْا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا
 اور جب اللہ نے اہل کتاب سے یہ وعدہ لیا کہ
 وہ کتاب کو لوگوں کے سامنے بیان کریں گے
 اور اس کو چھپائیں گے نہیں ان لوگوں نے
 اس قول و قرار کو پس پشت ڈال دیا۔

حجاج اس حق گوئی کی تاب نہ لاسکا اور حضرت یحییٰ بن لعمر کو خراساں کی طرف جلا وطن کر دیا۔

امام اوزاعی شام کے امام تھے وہ خود اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ جب سفاح کا چچا

عبداللہ بن علی شام میں آیا تو اس نے ایک دربار منعقد کیا اور اس میں مجھ کو بلایا۔ میں وہاں پہنچا تو

سواری سے اتار لیا گیا اور دو آدمیوں نے میرے بازو پکڑ کر مجھ کو ایسے مقام پر کھڑا کر دیا جہاں سے وہ

میرا کلام سن سکے۔ اب اس نے پوچھا "عبدالرحمن بن عمرو الاوزاعی تمہارا ہی نام ہے؟" میں نے

کہا، اللہ امیر کی اصلاح کرے یہ میرا ہی نام ہے" بولا "بنو امیہ کی خونریزی کی نسبت تمہارا کیا خیال

ہے؟" میں نے کہا "تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ تھا۔ اس لئے مناسب یہ تھا کہ تم اس کو

پورا کرتے" وہ بولا "ہمارے اور ان کے درمیان کوئی معاہدہ نہیں تھا۔ اوزاعی فرماتے ہیں۔

اس وقت میرا دل سراسیمہ ہو گیا۔ لیکن قیامت کے دن خدا کے خوف کا تصور کیا تو یہ ڈرا اور

اضطراب جاتا رہا، اس لئے میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ بنو امیہ کا خون تم پر حرام تھا وہ یہ

سن کر اس قدر برہم ہوا کہ آنکھیں نکل آئیں اور گردن کی رگیں پھول گئیں، کہنے لگا "خدا تم پر

رحم کرے تم نے ایسا کیونکر کہا" میں نے کہا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کسی مسلمان

کا خون اس وقت تک جائز نہیں جب تک تین حالتوں میں سے ایک حالت پیش نہ آئے،

یا تو اس نے شادی شدہ ہونے کی حالت میں زنا کیا ہو، یا کسی کو قتل کر دیا ہو یا وہ مرتد ہو گیا ہو"

عبداللہ بن علی نے کہا "کیا ہماری حکومت دینی نہیں ہے؟" میں نے کہا "کیونکر؟" کہنے لگا "کیا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؑ کے لئے وصیت نہیں کی تھی" میں نے کہا "اگر وصیت

کی ہوتی تو دو شخصوں کو حکم نہ بناتے“ اس پر وہ مارے غصہ کے آگ بگولا ہو گیا۔ اب مجھے یقین تھا کہ میرا سر قدموں پر گرا چاہتا ہے۔ لیکن اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ ان کو نکال دو۔ میں وہاں سے نکل کر تھوڑی دور آیا تھا کہ میرے پاس ایک سوار آیا۔ میں سمجھا یہ میرا سر کاٹنے آیا ہے اس خیال سے میں سواری سے اترنا کہ دو رکعت نماز پڑھ لوں۔ اس نے سلام کیا اور کہا کہ امیر نے آپ کے پاس دنا نیر بھیجے ہیں، امام ہمام نے یہ دینار قبول تو کر لئے لیکن فیاضی اور سیر چشمی کا یہ عالم تھا کہ گھر پہنچتے پہنچتے ختم کر دیئے۔

یہ چند واقعات متہ منونہ از خروارے ہیں ورنہ محدثین کرام کی زندگیوں کا مطالعہ کیجئے آپ کو بے شمار واقعات اسی قسم کے نظر آئیں گے۔ کسی حاکم وقت یا بادشاہ کی استرنا کے لئے حدیثیں وضع کرنا تو بہت بڑی بات ہے۔ کوئی محدث کسی جزئی مسئلہ میں جو رائے رکھتا تھا وہ بادشاہ کی رضامندی کے لئے اس کے اعلان و اظہار سے بھی باز نہیں آتا تھا۔ امام مالکؒ فرماتے تھے ”جبری طلاق واقع نہیں ہوتی“ منصور نے اس پر ناراض ہو کر ان کو نہایت بے رحمی کے ساتھ ذلیل کیا۔ لیکن امام جنت مقام پھر بھی یہی کہتے رہے ”جو مجھ کو جانتا ہے وہ جانتا ہے اور جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں انس کا بیٹا مالک ہوں اور کہتا ہوں کہ طلاق مکروہ واقع نہیں ہوتی اور اس کی کوئی حقیقت نہیں۔“

امام احمد بن حنبلؒ کو دروں سے مارا گیا۔ شدید سے شدید عقوبت دی گئی لیکن وہ بدستور اسی کا اعلان کرتے رہے القرآن کلام اللہ غیر مخلوق تو کیا ائمہ دین جو فقہی مسائل تک میں حکومت کی مخالفت اور جسمانی تکلیف و اذیت کی مطلق پروا نہیں کرتے تھے، ان سے یہ توقع ہو سکتی ہے کہ انھوں نے خود احادیث وضع کی ہوں گی یا احادیث موضوعہ کے قبول کرنے میں تاہل و تکاہل سے کام لیا ہوگا؟ سبحانک ہذا بہتان عظیم۔

محدثین کرام کی یہ جماعت مادی اعتبار سے کتنی ہی بے بضاعت اور بے سروسامان ہو

لیکن حق یہ ہے کہ یہ لوگ گدایانِ دارادل و سکندر دماغ تھے، اپنے ذریعہ معاش سے انھیں جو کچھ ملتا تھا اس پر صبر و شکر کے ساتھ قناعت کرتے تھے اور کسی سلطنت و حکومت کے جاہ و جلال اور دولت و ثروت کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے تھے۔ حضرت سعید بن المسیب کے پاس چار سو دینار تھے وہ اسی سے تجارت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ خلافتِ بنو امیہ کی جانب سے ان کی خدمت میں ۳۰ ہزار درہم پیش کئے گئے لیکن انھوں نے فرمایا

لا حاجت لی فیہا ولا فی
 بنی مروان حتی القی اللہ
 فی حکم بنی و بینہم
 اور ان کے درمیان فیصلہ کرے۔

خلفار سے ان بزرگوں کی بے نیازی کا اندازہ اس سے ہوگا کہ عبد الملک بن مروان نے ہر چند چاہا کہ حضرت سعید بن المسیب اپنی صاحبزادی کا نکاح اس کے لڑکے اور ولی عہد و لید سے کر دیں لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوئے۔ یہاں تک کہ ایک دن جب شدید سردی پڑ رہی تھی، عبد الملک نے انھیں پٹوایا اور ان پر پانی بہانے کا حکم دیا۔

محدثین کی احتیاط کوشی کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے انھوں کے مصداق خلفار اور امارات کے عطیات اور تحائف بھی قبول نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ جعفر بن یونس کو ایک لاکھ درہم پیش کئے تو انھوں نے بہ کمال استغناء یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ کہیں اہل علم یہ نہ کہیں کہ میں نے حدیث کی قیمت لے لی۔ ماموں رشید نے بھی ان کو دس ہزار کی رقم دینی چاہی لیکن انھوں نے اس کے قبول کرنے سے بھی انکار کر دیا اور فرمایا ولا شربت ماء یعنی حدیث کے معاوضہ میں تو میں ایک گھونٹ پانی بھی قبول نہیں کروں گا۔

ایک بار امیر مین نے حضرت طاؤس بن کيسان کی خدمت میں پانچ سو دینار بھیجے لیکن انھوں نے ان کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ امام ابو حنیفہؒ تجارت کر کے زندگی بسر کرتے تھے۔

اور سلاطین کے عطیات قبول نہیں کرتے تھے۔ خلیفہ مکتفی باللہ نے امام محمد بن جریر طبری سے ایک کتاب لکھوائی اور اس پر ان کو صلہ دینا چاہا تو انھوں نے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ لوگوں نے کہا ضرورت کے مطابق کچھ تولے لیجئے۔ فرمایا میں امیر المؤمنین سے درخواست کروں گا کہ مجھ کے دن سوال کرنے کی ممانعت کر دیں۔

بتائیے کیا ایسے بے نیاز، بے لوث، خود دار اور مخلص و دیانت شعار بزرگوں کی نسبت حدیثیں وضع کرنے یا احادیث ضعیفہ و موضوعہ کے قبول کرنے میں کسی قدر بھی جنبہ داری یا کسی کی رورعایت کرنے کا شک اور شبہ کیا جاسکتا ہے؟ ہاں بدگمانی یا منطقیانہ و فلسفیانہ شبہات کا علاج نہیں۔ جن کی وجہ سے دنیا کی سب سے زیادہ یقینی چیز بھی غیر یقینی قرار پاسکتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ دنیوی اور دینی احکام و امور پر اس شک کا مطلقاً کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ایسے شکی لوگوں کی نسبت ہم اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

وما علینا الا البلاغ و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین

ایک خط اور اس کا جواب

آخر میں ہم اس خط کو مع اس کے جواب کے درج کرتے ہیں جو رسالہ برہان میں "فہم قرآن" کی تین قسطیں ملاحظہ فرمانے کے بعد ہمارے محترم دوست مولانا عبدالملک صاحب آرومی نے لکھا تھا اور جس میں انھوں نے اپنے بعض ایسے شکوک و شبہات کا اظہار بے تکلفی کے ساتھ کر دیا تھا جو غالباً اکثر انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل میں گزرتے ہوں گے۔

حضرت مولانا صاحب زاد کرمہ۔ السلام علیک

آج "برہان" ملا۔ آپ نے "فہم قرآن" کے سلسلہ میں چودہ علوم کی معرفت لازم ٹھہرائی ہے، لغات، صرف و نحو اور تفسیر صحابہ (یعنی احادیث کی کتب تفسیر) کے علاوہ اور کون علوم ہیں؟ اور پھر سوال یہ ہوتا ہے کہ کسی فقیہ یا عالم دین کی اس اہم یا اجتہاد سے معارف قرآن اور نکات قرآن پر نقادانہ نظر ڈالنے کے لئے ان چودہ علوم کا جانا لازم کیسے آسکتا ہے میں اس کو نہیں سمجھا ذرا تفصیل سے سمجھائیے۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ جب تک درس نظامی کی فرسودہ کتابوں پر سرنہ کھپایا جائے فہم قرآن تدبر فی القرآن کی منزل آہی نہیں سکتی، اب آپ ہی فرمائیے کہ اللہ میاں باوجود اس قدر رحم و کرم کے ایسا جبر کیونکر پسند فرمائیں گے، چودہ علوم؟ معاذ اللہ! تو کیا باضابطہ ایک شخص بی، اسے پاس کر کے اگر لغات صرف و نحو اور احادیث کی مدد سے قرآن مجید کے دقائق و نکات سمجھنا چاہے تو گویا وہ اس سے بالکل محروم رہے گا۔ کیونکہ اب اس کے پاس وقت تو ہے نہیں کہ آٹھ سال تک دیومینہ یا نذرہ جا کر حصول خیر و برکت کرے۔ حالانکہ جہاں تک متن کے ترجمہ کا تعلق ہے اور اس سے استنباط مسائل کا، لاطینی

اور انگریزی زبانوں میں قرآن مجید کے متعلق ایسی ایسی کتابیں ملتی ہیں کہ عہدِ حاضر میں کسی ندوی یا (معاف کیجئے) دیوبندی کا وہاں تک گزر بھی نہیں ہو سکتا۔ اسی پر نیاز بگڑتے ہیں تو آپ چین جہیں ہوتے ہیں، بایں علم و فضل، روشن خیالی و وسعتِ مشربی، آپ پر بھی مولویوں کی "برہمنیت" طاری ہو گئی۔ اور آپ نے ویدوں کی طرح تعلیماتِ قرآنی اور اس کے فہم و عرفان کو بھی اپنی جماعت تک محدود کر لیا۔

”خدا توفیق کیش کفر بخشدیں پناہاں را“

محبت محترم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

واللہ اعلم، آپ یقین کیجئے میں کسی کی تنقید سے ناراض نہیں ہوتا، چہ جائیکہ آپ ایسے مخلص دوست کی تنقید سے، جس کی نیت، جس کے خلوص و محبت پر مجھ کو اعتمادِ تام ہے، آپ اس سے بھی زیادہ سخت اور ترش لہجہ میں کہتے ہیں برا نہیں مانوں گا، مگر ہاں شرط یہ ہے کہ آپ کا خلوص جو میرے ساتھ ہے اس خلوص سے کم نہ ہونے پائے جو آپ کو حضرت نیاز سے ہے۔ جس چیز پر تنقید کی گئی ہے اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ اول تو آپ اس معنی کو پیش نظر رکھئے جو میں ”فہم قرآن“ سے مراد لیتا ہوں اور جس کو سلنے رکھ کر میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں۔ میرا مقصد جیسا کہ میں نے اس مضمون کے دوسرے نمبر میں تحریر کر دیا ہے فہم قرآن سے یہ ہے کہ کوئی شخص اس کو پڑھ کر مجتہدانہ طور پر استنباطِ احکام کر سکے اور کلام کے مدلول و منطوق کو مکافقہ سمجھ سکے، تو اب اس معنی کے پیش نظر سوال پیدا ہوتا ہے کہ استنباطِ احکام کا حق کس کو حاصل ہو اور کون مجتہدانہ طور پر قرآن کے فہم کا ادعا کر سکتا ہے۔ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں فہم قرآن کے اس معنی کو ملحوظ رکھ کر لکھ رہا ہوں ورنہ اگر آپ فہم قرآن سے احکام امر و نہی کو معلوم کرنا اور جو مضامین اس میں بیان کئے گئے ہیں ان کو سطحی طور پر جان لینا مراد لیتے ہیں تو میں آپ کی مخالفت نہیں کروں گا۔ اور اس اعتبار سے بے شبہ فہم قرآن کے لئے شرائط وہ نہیں ہیں جو میں لکھ رہا ہوں۔

جہاں تک اس مسئلہ کی اصل حقیقت کا تعلق ہے وہ اس قدر واضح ہے کہ کسی بحث و نظر کی ضرورت ہی نہیں۔ دیوانِ غالب کو دہلی اور لکھنؤ کے لوگ جس طرح پڑھتے ہیں ایک پشاوری بھی اس سے اتنا ہی مزہ لیتا ہے لیکن کیا اس پر تنقید کا حق ہر ایک کو حاصل ہے؟ کیا اس پر نقد کرنے کے لئے اردو زبان کے مالہ و ماعلیہ، اس کے محاورات و طرق استعمال، قواعد فصاحت و بلاغت کے آئین و ضوابط، ذوق شعری، فلسفہ وغیرہ وغیرہ ان چیزوں کے نہ صرف جاننے بلکہ ان میں ایک نظر وسیع پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ غالب کا یہ شعر۔

مری تعمیر میں مضمربے ایک صورت خرابی کی

ہیولی برقی خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

اس کا تھوڑا بہت مطلب ہر اردو خواں اور کالج کا ہر ایک گریجویٹ سمجھ سکتا ہے لیکن کیا اس کی شرح کا حق ہر ایک کو ایسا ہی ہے جیسا کہ عبدالرحمن بجنوری مرحوم، عبدالمالک آروی، نیاز فتحپوری اور حسرت موہانی کو ہے؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو پھر آپ کلام مجید کے متعلق اس حیثیت سے نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، بلکہ اس حیثیت سے بھی کہ وہ ایک مکالمہ کا کلام ہے۔ کس طرح یہ فرما سکتے ہیں کہ اس کے مدلول و منطوق کو سمجھنے کے لئے عربی کی معمولی شد بد کافی ہے، اس ادعا سے آپ کے خیال و استنتاج کے برعکس ویدوں کی طرح قرآن مجید کا اسلامی برہمنوں کے ساتھ مخصوص ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ ہمارے ادعا کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کو مجتہدانہ طور پر سمجھنے کے لئے چند شرائط ہیں ٹھیک ایسے ہی جیسے ہر آسان سے آسان علم و فن میں کمال پیدا کرنے کے لئے چند شرائط ہوتے ہیں۔ ہر شخص جو ان شرائط کو پورا کر سکے گا ہم قرآن کا مدعی ہو سکتا ہے۔ اس میں ذات، پات مقام و نسب وغیرہ کسی کی کوئی قید نہیں۔ جس طرح طب آسان ہے مگر اس کے لئے قانونِ شیخ وغیرہ کا مطالعہ ضروری ہے۔ ہر شخص ڈاکٹر، وکیل اور پروفیسر ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس نے ایم بی بی ایس، ایل ایل بی، با ایم اے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کر رکھی ہوں۔ اسی طرح ہم کہتے ہیں قرآن آسان ہے۔ ہر شخص کو اس میں

تدبر اور تفکر کرنا چاہئے مگر اس کے لئے چند شرائط ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس ادعا سے میری برہمنیت کس طرح لازم آجاتی ہے۔

اب رہا چودہ علوم کی شرط کا معاملہ تو یہ واضح رہنا چاہئے کہ یہ چودہ علوم براہ راست فہم قرآن کے لئے ضروری نہیں، بلکہ علماء ادب و بلاغت کے نزدیک کوئی شخص عربی نظم و نثر کو بخوبی سمجھ نہیں سکتا جب تک وہ ان علوم میں دسترس نہ رکھتا ہو اور فہم قرآن کے لئے اولین ضرورت عربی کلام کو کا حقہ سمجھنے کی صلاحیت ہے اس بنا پر لازم یہ آگیا کہ فہم قرآن عجیبوں کے لئے ان علوم کے بغیر دشوار ہے یہ کس نے کہا کہ ندوہ یا دیوبند میں ہی ان علوم کی تحصیل کیجئے بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ ان علوم کی بھی ضرورت نہیں اگر آپ کسی اور طریقہ سے کلام عربی کو سمجھنے کی استعداد رکھتے ہیں تو سبحان اللہ! پھر احمق ہے جو آپ سے کہے کہ ان علوم کو حاصل کیجئے۔

میں اگر ان علوم ادب کے بغیر امر القیس، اعشی، طرفہ کے عربی کلاموں کو ان کی فصاحت و بلاغت کے ادراک و شعور کے ساتھ سمجھ نہیں سکتا تو ظاہر ہے ان کے بغیر قرآن مجید کو جو عربی زبان کی انتہائی فصیح و بلیغ کتاب ہے کس طرح سمجھ سکتا ہوں۔ پس ہر وہ شخص جو آج فہم قرآن کا مدعی ہے اس سے دریافت کیجئے کیا وہ شعر عرب کو جانتا ہے؟ کیا وہ عربی شعرا کے کلام کو بے تکلف سمجھ سکتا اور ان کے نکات و لطائف کو معلوم کر سکتا ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو اسے کیا حق ہے کہ وہ محض ترجمہ کی مدد سے قرآنی آیات کی تشریح و توضیح شروع کر دے۔ اقبال کی رموزِ بخودی کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ لیکن بتائیے کیا ایک انگریزی ترجمہ کے ذریعہ اقبال کو جاننے والا اقبال کے کلام سے اتنا ہی محظوظ ہو سکتا ہے جتنا ایک ایرانی یا فارسی کا کوئی خوش مذاق شخص؟

آپ نے مجھ کو مولویانہ "برہمنیت" کا طعنہ دیا ہے۔ حالانکہ میرا مقصد بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ میں "ہر بوا ہوس کی حسن پرستی" گوارا نہیں کر سکتا، ہاں "شیوہ اہل نظر" رکھنے والے شوق سے آئیں اور قرآن کے حسن جہاں آرا کے جلووں سے بہرہ اندوز ہوں۔ میں حسن کو صرف ایک تفریحی نظر بازی کی چیز نہیں سمجھتا بلکہ میں اس کی بارگاہ میں سودائے عشق سے بھرے ہوئے سروں کو

ختم دیکھنا چاہتا ہوں۔

آپ نے یہ بجا لکھا ہے کہ غریب نڈلیوں اور دیوبندیوں کو تو ان کتابوں کی ہوا بھی نہیں لگتی جو لاطینی اور انگریزی زبانوں میں قرآن مجید کے متعلق موجود ہیں، لیکن سوال صرف یہ ہے کہ اس سے نقص کیا لازم آیا؟ زیادہ سے زیادہ یہی کہ ایک غیر زبان دان نے جو تفسیر کی تھی وہ معلوم نہیں ہو سکی، لیکن اگر ایک شخص عربی نہیں جانتا تو آپ جانتے ہیں، وہ قرآن فہمی کے اعتبار سے کس قدر گھائے میں ہے وہ اس زبان کو نہیں جانتا جس میں قرآن نازل ہوا۔ اس کے اقوال و افعال سے بے خبر ہے جس پر قرآن اترا، اس ماحول سے نا آشنا ہے جس میں قرآن کا نزول ہوا۔ اور ان چیزوں کے متعلق اگر اس کے پاس چند معلومات ہیں بھی تو ان لوگوں کی وی ہوئی جن کو "اجنبی" یا "مرد بیرون خانہ" کہا جاسکتا ہے۔ اب فرمائیے نقصان عظیم میں کون ہے؟ پہلا شخص یا دوسرا؟ بھائی اس دور میں سب سے بڑی مصیبت تو یہی ہے کہ ہم قرآن کی تفسیر بھی ابن عباسؓ اور ابن عمرؓ کے بجائے انگریزوں کی زبان سے سنا چاہتے ہیں، کہتے کیا آپ کی غیرت گوارا کر لگی کہ آپ اردو کے ایک شعر کا مطلب داغ و امیر کے بجائے کسی انگریز سے دریافت کریں۔ درآں حالیکہ وہ اردو کے ذوق شعری سے نا آشنا محض ہو۔

آپ تحریر فرماتے ہیں کہ "آپ کی شرط کے مطابق ایک شخص جو "بی اے" ہے اور تدریس فی القرآن کرنا چاہتا ہے اگر اس سے یہ کہہ دیا جائے کہ تم پہلے چودہ علوم حاصل کرو تب اس قابل ہو سکتے ہو تو اس سے نرا جبر لازم آئے گا اور اللہ تعالیٰ اس قدر فضل و کرم کے باوجود کس طرح یہ جبر گوارا کرے گا۔" میں کہتا ہوں کہ اگر ہر شخص طبیب نہیں ہو سکتا تو کیا وہ اپنے امراض کے علاج کے لئے کسی طبیب حاذق پر اعتماد نہ کرے، آپ کی تحریر سے تو یہ لازم آتا ہے کہ ہر شخص جسے اپنے کسی مرض کے علاج کی ضرورت ہو اسے طب حاصل کرنی چاہئے۔ ہر شخص جو عدالت میں کوئی مقدمہ لڑنا چاہتا ہے اس کو بیرسٹری کا ڈپلومہ لینا چاہئے، جس شخص کو مکان بنانے کی ضرورت ہو اس کو انجینیری کی تعلیم حاصل کرنی ضروری ہے اور اسی طرح جو شخص قرآن مجید میں برکرا چاہتا ہے

وہ تمام مشائخِ دنیویہ کے ہوتے ہوئے بھی قرآن کو مجتہدانہ طور پر سمجھ سکتا ہے۔ پس ہر شخص کو اجتہادی طور پر "تدبر فی القرآن" کی دعوت دینا یہ جبر ہے، یا یہ کہ تقسیمِ عمل کے اصول پر کام کیا جائے اور ہم جس طرح دنیوی معاملات میں ڈاکٹروں، بیرٹروں، پروفیسروں اور انجنیروں کی جماعت پر اعتماد کرتے ہیں اسی طرح دینی و مذہبی معاملات میں بھی ایک جماعت ہو جس پر ہم اعتماد کلی کریں اور ہر ایک شخص سے یوں نہ کہیں کہ اس کو خود اس جماعت (علماء دین) سے بے پروا ہو کر اپنی رائے اور عقل کے مطابق تفسیر کرنی چاہئے۔ آپ شوق سے "تدبر فی القرآن" کیجئے خدا آپ کے عزائم میں برکت اور حوصلوں میں وسعت عطا فرمائے لیکن اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو اس کو محض اس بنا پر کہ وہ آپ کی سمجھ میں نہیں آتی ہے اور اگرچہ اس کو بڑے بڑے ائمہ کرام نے لکھا ہے رو نہ کیجئے۔

